ماہنامہ

اشراق

لاہور

دسمبر ۲۰۲۴ء

1979 سے جاری شدہ
اشاعت کے 46 سال

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

”قرآن مجید میں یہ بات کئی جگہ بیان ہوئی ہے کہ یہ کتاب دین کی ہر چیز کو بیان کرتی ہے: ’تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ‘(النحل ۱۶: ۸۹)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے تمام تصورات اسی کتاب سے ماخوذ ہونے چاہییں۔ جس دینی تصور کا بنیادی ماخذ غیر قرآن ہے، اسے دین اسلام کا جزو سمجھنا دین میں اضافہ ہے۔دین کے اصول و مبادی کے باب میں یہ دلیل مردود ہے کہ کچھ امور مسلمانوں کے اجتہاد پر موقوف ہیں۔ ’تعلق باللہ‘ کی تعبیر قرآن مجید میں ان یا ان سے ملتے جلتے الفاظ میں مذکور نہیں ہے۔قرآن مجید کا اسلوب ہی یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد تصورات کو بیان کرے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا تعارف بھی صفات اور امور الٰہی کے بیان سے کراتا ہے اور بندوں سے متعلق ہدایت بھی عقائد و اعمال کے حسن و قبح کے بیان سے دیتا ہے۔“

—— شذرات

- جن لوگوں کا معاملہ ایسا واضح ہو، جیسا کہ فرعونیوں کا تھا، اُن پر مرنے کے بعد ہی اُن کے اعمال کے اعتبار سے کیفیات کا صدور ہونے لگتا ہے۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا حساب پوچھنے اور اُن کے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔(قرآنیات)
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کار دعوت کیا تھا، اس کا رخ عرب کے تمام اہل مذہب کو ان گم راہیوں سے پاک کرنا تھا جن میں وہ مبتلا تھے۔یہی سبب سمجھ میں آتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کی مساعی کا ہدف بھی یہی تھا کہ دین حق بے کم و کاست اگلی نسل تک پہنچ جائے۔(شذرات)
- پاکستان دور جدید کی ایک قومی ریاست ہے۔ قومی ریاست اس اصول پر بنائی جاتی ہے کہ ایک خاص خطۂ ارض میں جو لوگ رہ رہے ہیں، وہ برابر کے شہری ہیں۔ جب وہ برابر کے شہری ہیں تو حکومت بھی ان سب کی نمائندہ ہوتی ہے۔(یسئلون)

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق وتنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر واشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم وتعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما وصالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب ونظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیرسرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۶ شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۲۴ء جمادی الثانی ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات
تعلق باللہ — طالب محسن — ۴

قرآنیات
البیان: المومن ۴۰: ۲۳-۵۵ (۲) — جاوید احمد غامدی — ۷

معارف نبوی
دن کی نفل نمازیں — حدیث سیل/ شاہد رضا — ۲۰

مقالات
میزان: توضیحی مطالعہ: اصول ومبادی (۲) — ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر — ۲۷

سیر و سوانح
قبیلہ بنو عبدالدار کے مومن اور مشرک — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۶

نقطۂ نظر
بچوں سے قرآن حفظ کرانا — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۳۹
ہندومت اور تصور نبوت؟ (۲) — مشفق سلطان — ۴۶

نقد و نظر
مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ: یونان یا قرآن — سجاد بشیر — ۵۲

اصلاح و دعوت
توبہ کا قانون — کوکب شہزاد — ۶۲

یسئلون
پاکستان میں مندر کی تعمیر — شاہد رضا — ۶۶

شخصیات
حیات امین احسن (۱۵) — محمد بلال — ۶۸

اشاریہ
اشاریہ ماہنامہ "اشراق" ۲۰۲۴ء — نعیم احمد — ۷۵

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

طالب محسن

تعلق باللہ

تعلق باللہ کی یہ ترکیب ہمارے ہاں ایک مذہبی تصور کو بیان کرنے کے لیے مستعمل ہے۔ ہر علم کچھ تصورات وجود میں لاتا ہے۔ اس کے لیے مصطلحات یا کچھ تعبیرات بھی مخصوص کرتا ہے۔ اسی طرح کی ایک تعبیر یہ بھی ہے۔ علم کے میدان میں ایک روایت ہے کہ اعراض اور جوہر کو الگ الگ بیان کیا جائے۔ اللہ سے تعلق عقائد کی صحت، احوال قلب کے حصول، صفات و سنن الٰہی کا شعور، اذکار باللسان اور اعمال بالجوارح سے عبارت ہے۔ یہ اس کے اعراض ہیں اور یہ تعلق ان سے مجرد بھی ایک حقیقت ہے، وہ اس کا جوہر ہے۔ تعلق باللہ کی ترکیب اسی جوہر کے لیے وضع ہوئی ہے۔

ہماری علمی تاریخ کا آغاز صحت علم کے کام سے ہوا تھا۔ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے اقدامات سے تمام ترددات سے محفوظ ہو گیا، لیکن دین پر عمل میں پیش آنے والے سوالات کے جواب حاصل کرنے میں دو علم ابتدائی صدیوں میں مساعی کا ہدف رہے۔ ابتدا میں فقہی مباحث پر اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تحصیل و تنقیح پر اہل علم نے اپنی مساعی صرف کیں۔ ایک طرف پھیلتی ہوئی ریاست کی ضروریات تھیں اور دوسری طرف کئی ہزار نو مسلم اور تابعین اور تبع تابعین تھے، جو دین سیکھنے کے لیے ان بزرگوں کو مرجع بنائے ہوئے تھے جنھوں نے تعلیم و تعلم کا منصب سنبھال لیا تھا۔

ان دونوں ادوار میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، زیادہ زور صحت علم پر رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کار دعوت کیا تھا، اس کا رخ عرب کے تمام اہل مذہب کو ان گم راہیوں سے پاک کرنا تھا جن میں

وہ مبتلا تھے۔ یہی سبب سمجھ میں آتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کی مساعی کا ہدف بھی یہی تھا کہ دین حق بے کم و کاست اگلی نسل تک پہنچ جائے۔ کسی طرح کی کوتاہی نہ ہو، کسی طرح کی آمیزش نہ ہو اور کسی طرح کا انحراف نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب کچھ اسباب کے تحت کوئی ترجیح قائم ہو جاتی ہے تو کچھ امور وہ توجہ نہیں حاصل کر پاتے جو ان کو حاصل ہونی چاہیے تھی۔ قرآن مجید اور سنت میں اگرچہ دین اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ مرقوم ہے، لیکن نمایاں اہل علم کی توجہات تدوین دین کے کام کی طرف تھیں۔ اس کے نتیجے میں دین داری کے بعض احوال اور اوضاع لوگوں کے حسن ذوق اور طرز ادراک پر منحصر ہو گئے۔

چنانچہ ابتدائی صدیوں میں کچھ صالحین نے اور بعد میں صوفیا نے اس پہلو سے وعظ و نصیحت اور اعمال و اوراد کی ایک روایت پیدا کر دی، جس نے بعد میں ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر کو بھی اپنا لیا اور اس طرح تصوف کے نام سے ایک باقاعدہ نظام فکر و عمل وجود پذیر ہو گیا۔ تعلق باللہ کی تعبیر بھی اسی مکتب فکر کے بعض رجحانات کی ترجمان ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات کئی جگہ بیان ہوئی ہے کہ یہ کتاب دین کی ہر چیز کو بیان کرتی ہے: 'تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ' (النحل ۱۶: ۸۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے تمام تصورات اسی کتاب سے ماخوذ ہونے چاہییں۔ جس دینی تصور کا بنیادی ماخذ غیر قرآن ہے، اسے دین اسلام کا جزو سمجھنا دین میں اضافہ ہے۔ دین کے اصول و مبادی کے باب میں یہ دلیل مردود ہے کہ کچھ امور مسلمانوں کے اجتہاد پر موقوف ہیں۔ 'تعلق باللہ' کی تعبیر قرآن مجید میں ان یا ان سے ملتے جلتے الفاظ میں مذکور نہیں ہے۔ قرآن مجید کا اسلوب ہی یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد تصورات کو بیان کرے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا تعارف بھی صفات اور امور الٰہی کے بیان سے کراتا ہے اور بندوں سے متعلق ہدایت بھی عقائد و اعمال کے حسن و قبح کے بیان سے دیتا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ کی نسبت سے انسان کے لیے 'عبد' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح انسان کی نسبت سے اللہ کے لیے 'الٰہ' اور 'رب' کے الفاظ آئے ہیں۔ الٰہ واحد کا مطلب یہ ہے کہ عالم تکوین کے تمام فیصلے اسی ذات کی جانب سے ہوتے ہیں۔ رب کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس عالم کا لاشریک بادشاہ ہے۔ بندہ وہ ہے جو اس کی رضاجوئی کے لیے اس کی پرستش اور اس کی فرماں برداری میں سرگرم ہے۔

انسان اور جنات زمین پر آباد دو مخلوقات ہیں، جن کی حیات ثانی کی خبر قرآن مجید میں موجود ہے۔ دونوں کے نیک و بد اس حیات ثانی میں اپنے انجام کو پائیں گے۔ آخرت کا یہ عقیدہ تعلق باللہ کی صورت گری میں سب سے بڑا عامل ہے اور ہونا چاہیے۔ اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ انسان کی اصل منزل حیات بعد الموت

ہے۔اس حیات کی ساری سرگرمیاں اصل نہیں ہیں۔اس دوسری زندگی کے لیے ہمارے انجام کے متعین کرنے کا ذریعہ ہیں۔دوسری یہ کہ انسان اس وسیع کائنات میں دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اس مخلوق کو دہری زندگی سے نوازا گیا ہے۔پہلی زندگی کا اصل عنوان امتحان ہے اور دوسری زندگی کا اصل عنوان جزا ہے۔یہاں انسان ایک مخلوق ہی کی حیثیت سے انعام اور رضوان کی زندگی پائے گا۔یہ تو ممکن ہے کہ غیب کے کچھ پردے ہٹا دیے جائیں، لیکن بندگی کے مقام میں کوئی تبدیلی واقع ہونے والی نہیں۔

قرآن مجید میں صحابہ کا یہ حال مکرر بیان ہوا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ ان سے راضی ہو گیا (البینہ ۹۸:۸)۔بندگی کا ذروۂ سنام یہی ہے۔یہ خدا کے مقام کے اس شعور، جو قرآن کے بڑے موضوعات میں سے ایک ہے، کی تفہیم کا حاصل ہے۔وہ ہمارا واحد الٰہ ہے۔ہماری ساری سرگرمیاں، خواہ وہ امور دنیا سے متعلق ہوں اور خواہ ان کا تعلق ہمارے دین سے ہو، اس کی اتاری ہوئی ہدایت کے مطابق ہوں اور اس کی رضا کی خواہش اور اس کے غضب سے بچاؤ ان کا اول و آخر محرک ہو۔

قرآن مجید نے اپنے بندوں کی صفات، ان کے اعمال، ان کے رویوں، ان کے داخلی احساسات، ان کے مقاصد اور ان کے عقائد کو جگہ جگہ بیان کیا ہے۔تعلق باللہ کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ یہی چیزیں قرآن کے بیان کے مطابق بندے کی شخصیت بن جائیں۔اس کا عنوان صرف بندگی ہے۔پورے دل اور پوری جان کے ساتھ بندگی۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المؤمن

(۲)

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَھَامٰنَ
وَقَارُوۡنَ فَقَالُوۡا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَھُمۡ بِالۡحَقِّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوا

اِسی طرح ہم نے موسیٰ کو بھی فرعون اور ہامان[۱۰۷] اور قارون[۱۰۸] کی طرف اپنی نشانیوں اور ایک واضح حجت[۱۰۹] کے ساتھ بھیجا تھا تواُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ ایک جادوگر ہے، سخت جھوٹا۔[۱۱۰]

۱۰۷۔ یہ فرعون کا دست راست اور اُس کے تمام مظالم میں پوری طرح شریک تھا۔ قرآن کے بیانات سے اشارہ نکلتا ہے کہ اِس کی حیثیت غالباً اُس کے وزیر اعظم کی تھی۔

۱۰۸۔ یہ اگرچہ بنی لاوی میں سے اور موسیٰ علیہ السلام کے سگے چچا کا لڑکا تھا، لیکن اُن کی مخالفت میں اِس کا رویہ بالکل وہی تھا جو ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اختیار کیا۔ بائیبل میں اس کا نام قورح آیا ہے اور قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے حد دولت منداور اپنی دولت کے گھمنڈ میں مبتلا رہنے والوں میں سے تھا۔

۱۰۹۔ اِس سے عصا کا معجزہ مراد ہے جو درحقیقت موسیٰ علیہ السلام کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی ایک سند تھا۔ اِس کے علاوہ جو نشانیاں اُن کو دی گئیں، اُن کی تفصیل قرآن نے سورۂ اعراف (۷) کی آیت

اقۡتُلُوۡۤا اَبۡنَآءَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ وَاسۡتَحۡیُوۡا نِسَآءَہُمۡ ؕ وَمَا کَیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ

پھر جب وہ ہماری طرف سے حق لے کر اُن کے پاس آگیا تو اُنھوں نے حکم دیا کہ جو لوگ اِس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اُن کے بیٹوں کو قتل کرو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو۔[111] لیکن اِن منکروں کی یہ تدبیر بالکل رایگاں گئی۔[112] ۲۳-۲۵

(اپنی اِس ناکامی کو دیکھ کر) فرعون نے (درباریوں سے) کہا: مجھے چھوڑو،[113] میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور (اپنی مدد کے لیے اب) وہ اپنے رب کو بلا لے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمھارا

---

۱۳۳ میں کر دی ہے۔

۱۱۰۔ یعنی اِس شخص کے معجزے محض جادوگری ہیں اور اِس کا یہ دعویٰ کہ اِسے خدا نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، محض جھوٹ ہے۔

۱۱۱۔ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹانے اور اُن کو مغلوب رکھنے کی یہ ظالمانہ پالیسی اگرچہ پہلے سے چل رہی تھی، لیکن موسیٰ علیہ السلام کی دعوت برپا ہوئی تو اِسے مزید شدت کے ساتھ جاری رکھنے کا فرمان صادر ہوا۔ یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ اِس میں بلاغت کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر 'بیٹوں' کے لفظ سے ہوا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے 'تمھاری عورتوں' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے تو پدری شفقت کے جذبات کو مجروح کرتی ہے اور دوسری غیرت کو چیلنج کرنے کا باعث بنتی ہے۔

۱۱۲۔ یعنی اِس کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے، وہ سب ناکام ہو گئے اور بنی اسرائیل کی طاقت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔

۱۱۳۔ یہ اسلوب بتا رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور شخصیت کو اُس وقت تک ایسی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ فرعون جیسا مطلق العنان بادشاہ بھی اپنے اعیان و اکابر کی تائید کے بغیر اُن پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں سمجھتا تھا۔

دِيۡنَكُمۡ اَوۡ اَنۡ يُّظۡهِرَ فِى الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ ﴿٢٦﴾ وَقَالَ مُوۡسٰٓى اِنِّىۡ عُذۡتُ
بِرَبِّىۡ وَرَبِّكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤۡمِنُ بِيَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿٢٧﴾
وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ۖ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَكۡتُمُ اِيۡمَانَهٗۤ اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ
يَّقُوۡلَ رَبِّىَ اللّٰهُ وَقَدۡ جَآءَكُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ وَاِنۡ يَّكُ كَاذِبًا

دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں فساد نہ پھیلا دے۔[114] موسیٰ (نے یہ بات سنی تو اُس) نے کہا: میں نے ہر اُس متکبر کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ لے لی ہے۔[115] ۲۶-۲۷

(یہی موقع تھا کہ) فرعون کے خاندان میں سے ایک بندۂ مومن[116] نے، جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا،[117] کہا: کیا تم ایک شخص کو محض اِس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب

۱۱۴۔ یعنی میری قوم کے لوگ بھی اُس کی دعوت سے متاثر ہو کر اُسے قبول نہ کر لیں یا اپنی قوم کے لوگوں کو، جنھیں ہم نے غلام بنا رکھا ہے، منظم کر کے وہ ہمارے خلاف بغاوت نہ کرا دے۔

۱۱۵۔ یہ اُس پناہ کا حوالہ ہے جو رسولوں کو اُن کے مخالفین کے مقابل میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ 'وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'* (اللہ اِن لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا)۔

۱۱۶۔ یہ اُسی بندۂ مومن کا ذکر ہے جس کے بارے میں سورۂ یٰسٓ (۳۶) کی آیت ۱۴ میں فرمایا ہے کہ پھر ہم نے ایک تیسرے سے اپنے دو پیغمبروں کی مدد کی۔ یہ شاہی خاندان کے ایک فرد تھے، لیکن اِن کی ہم دردیاں شروع ہی سے حضرت موسیٰ کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ سورۂ قصص (۲۸) میں ہے کہ جب اُن کے ہاتھوں اتفاقاً ایک قبطی کا قتل ہو گیا تو یہی دوڑتے ہوئے آئے اور موسیٰ علیہ السلام کو اعیان حکومت کے برے ارادوں سے آگاہ کیا اور مصر سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔

۱۱۷۔ اِس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُس وقت تک وہ ایمان کے اظہار کو خود موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی دعوت

* المائدہ ۵: ۶۷۔

فَعَلَيۡهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنۡ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبۡكُمۡ بَعۡضُ الَّذِيۡ يَعِدُكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَهۡدِيۡ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يٰقَوۡمِ لَكُمُ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ظٰهِرِيۡنَ

اللہ ہے؟ حالاں کہ وہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نہایت واضح نشانیاں لے کر آیا ہے۔[118] (خدا کے بندو)، اگر وہ جھوٹا[119] ہے تو اُس کے جھوٹ کا وبال اُسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہے تو جس عذاب کی وعید وہ تمھیں سنا رہا ہے، اُس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کر رہے گا۔[120] یقین رکھو، اللہ کسی ایسے شخص کو بامراد نہیں کرے گا جو حد سے گزرنے والا ہو، سخت جھوٹا ہو۔[121] میری قوم

کے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ فرعون اب اُن کے قتل کے درپے ہو رہا ہے تو اُنھوں نے مصلحت کی نقاب اتار کر پھینک دی اور یہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

۱۱۸۔ اِس ایک ہی فقرے میں اُنھوں نے فرعون اور اُس کے اعیان کے سامنے کئی حقائق رکھ دیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”ایک تو یہ کہ اللہ ہی کو اپنا رب ماننا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اِس میں کسی اختلاف کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے تو وہ ایک نہایت روشن حق کا اظہار کر رہا ہے جس پر وہ تائید و تحسین کا سزاوار ہے نہ کہ قتل کا۔ بڑے ہی ظالم ٹھیریں گے وہ لوگ جو ایسے شخص کے قتل کی جسارت کریں گے۔
>
> دوسری یہ کہ جو نشانیاں لے کر آئے ہیں، وہ اُن کے فرستادۂ الٰہی ہونے کی نہایت واضح دلیل ہیں۔ صرف اندھے ہی اُن کے خدائی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔
>
> تیسری یہ کہ جس رب کے رسول کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں، وہ تمھارا بھی رب ہے۔ یہ تمھاری جہالت ہے کہ تم اُس کے سوا کسی اور کو رب بنائے بیٹھے ہو۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۳۹)

۱۱۹۔ یعنی تمھارے خیال میں۔ یہ اسلوب اپنی طرف سے کسی شک کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ بر سبیل تنزل محض مخاطب کی رعایت سے اختیار کیا جاتا ہے۔

۱۲۰۔ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔

۱۲۱۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو فرعون پر نہایت بلیغ تعریض ہے، اگرچہ بات ایک کلیے کے انداز میں کہی گئی ہے۔

فِی الۡاَرۡضِ ۫ فَمَنۡ یَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰہِ اِنۡ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِیۡکُمۡ
اِلَّا مَاۤ اَرٰی وَ مَاۤ اَہۡدِیۡکُمۡ اِلَّا سَبِیۡلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾
وَ قَالَ الَّذِیۡۤ اٰمَنَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ﴿ۙ۳۰﴾
مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ

کے لوگو، آج تمھیں بادشاہی حاصل ہے کہ ملک میں تمھارا غلبہ ہے،[۱۲۲] لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو مجھے بتاؤ کہ کون ہے جو اُس کے مقابل میں ہماری مدد کر سکے گا؟ فرعون نے کہا: میں تم کو وہی رائے دے رہا ہوں جو میں سمجھتا ہوں کہ اِس وقت دینی چاہیے اور تم کو وہی راہ دکھا رہا ہوں جو ٹھیک ہے۔[۱۲۳] ۲۸-۲۹

اُس شخص نے، جو ایمان لے آیا تھا، (اِس مداخلت کی پروا نہیں کی اور بات جاری رکھتے ہوئے) کہا: میری قوم کے لوگو، (تم نے موسیٰ کو قتل کرنے کی کوشش کی تو) مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر بھی اُسی طرح کا دن نہ آجائے جو (اِس سے پہلے) بہت سے گروہوں پر آچکا ہے اور وہی حال نہ ہو، جیسا نوح کی قوم اور عاد و ثمود[۱۲۴] اور اُن لوگوں کا حال ہوا تھا جو اُن کے بعد ہوئے۔ (اِس لیے کہ

۱۲۲۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَکُمُ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ، ظٰہِرِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ'۔ اِن میں 'ظٰہِرِیۡنَ' ہمارے نزدیک 'لَکُمۡ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۱۲۳۔ فرعون نے یہ بات اُن کی بات کاٹ کر کہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس بے محل مداخلت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اِس مرد مومن کی تقریر بغیر کسی مداخلت کے جاری رہی تو اِس سے اُس کے بہت سے درباری متاثر ہو جائیں گے۔ اِس وجہ سے ہوشیار سیاسی لیڈروں کی طرح اُس نے اپنی نیک نیتی، اصابت رائے اور مصلحت اندیشی کی دھونس جمانے کی کوشش کی۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۴۱)

۱۲۴۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ سب قومیں فرعون سے پہلے ہو چکی تھیں اور اِن کے حالات بھی اُس عہد کے

ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيٰقَوۡمِ اِنِّيۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ يَوۡمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ
مُدۡبِرِيۡنَ ۚ مَا لَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ
هَادٍ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَيِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِيۡ شَكٍّ
مِّمَّا جَآءَكُمۡ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلۡتُمۡ لَنۡ يَّبۡعَثَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا ؕ
كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُ ﴿۳۴﴾ ۚۖ الَّذِيۡنَ يُجَادِلُوۡنَ فِيۡۤ اٰيٰتِ

رسولوں کی تکذیب کے بعد وہ اِسی کے مستحق تھے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ میری قوم کے لوگو، میں تم پر ہانک پکار کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے اور تمھیں خدا سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔(اِس کے باوجود نہیں سمجھتے ہو تو اِس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ) جنھیں اللہ گم راہ کر دے، اُن کو پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔[۱۲۵] اِس سے پہلے یوسف بھی تمھارے پاس اِسی طرح نہایت واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے تو جو باتیں وہ تمھارے پاس لے کر آئے تھے، اُن کی طرف سے تم شک ہی میں پڑے رہے، یہاں تک کہ جب اُن کی وفات ہو گئی تو تم نے کہہ دیا کہ (یہ بھی رسول نہیں تھے اور) اللہ اِن کے بعد بھی (ہماری طرف) ہرگز کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔[۱۲۶] اللہ اِسی طرح اُن لوگوں کو گم راہ کرتا ہے جو حد سے بڑھے ہوئے اور شک میں پڑے ہوتے ہیں۔[۱۲۷] وہ جو بغیر کسی

لوگوں کے لیے معلوم و معروف تھے۔

۱۲۵۔ اللہ کس طرح گم راہ کرتا ہے؟ پیرے کے آخر میں اِس کی وضاحت فرما دی ہے۔

۱۲۶۔ یعنی نہ صرف یہ کہ یوسف علیہ السلام کو نہیں مانا، بلکہ آیندہ کے لیے بھی فیصلہ کر دیا کہ جس طرح اب تک خدا نے ہمارے پاس کوئی رسول نہیں بھیجا، آیندہ بھی نہیں بھیجے گا۔

۱۲۷۔ یہ اُس سنت الٰہی کی وضاحت ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ جس اصول پر مبنی ہے، اُس کی طرف ... جگہ جگہ ہم اشارہ کر چکے

اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾
وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾ اَسْبَابَ

دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک اور ایمان والوں کے نزدیک یہ سخت مبغوض ہے۔ اللہ اِسی طرح ہر مغرور اور سرکش کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔[128] ۳۰-۳۵

فرعون نے (پھر مداخلت کی[129] اور اُن کا مذاق اڑاتے ہوئے) کہا کہ اے ہامان، میرے لیے

ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو خیر و شر کی جو معرفت اور عقل و فہم کی جو نعمت اُس نے بخشی ہے، لوگ اُس کی قدر کریں۔ جو لوگ اِن کی قدر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ہدایت و معرفت کی مزید راہیں کھولتا ہے۔ جو اِن کی قدر نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہو کر واضح سے واضح حق کو بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے اور اِسی مقصد کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کرتے ہیں، اُن کو مزید ہدایت دینا تو الگ رہا، اُن کی اِس ناقدری کی پاداش میں اللہ تعالیٰ اُن کا وہ نور بھی سلب کر لیتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۴۳)

۱۲۸۔ یعنی اِس لیے مبغوض ہیں کہ بغیر کسی دلیل کے کج بحثی کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ذہنوں میں یہ غرور سما جاتا ہے کہ اُن کے مزعومات کے خلاف کوئی بات حق کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ، ظاہر ہے کہ نہایت قابل نفرت رویہ ہے۔ چنانچہ اللہ اِس کی پاداش میں اُن کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے، جس سے اُن کی عقلیں الٹ جاتی ہیں اور یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوتا ہے، جس کی وضاحت اوپر ہوئی ہے۔

۱۲۹۔ بندۂ مومن کی تقریر جس عروج پر پہنچ گئی تھی، اُس سے قدرتی طور پر اہل دربار متاثر ہوتے نظر آئے ہوں گے۔ چنانچہ اُس نے پھر مداخلت کی اور وہ بات کہی جو آگے بیان ہوئی ہے۔ یہ محض ایک اشغلہ تھا جو اِس لیے چھوڑا گیا کہ اِس تقریر کے نتیجے میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کسی سنجیدہ بحث کا موضوع نہ بنے، بلکہ مذاق کا موضوع بن کر رہ جائے۔

السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ
سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾
وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ؗ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا
يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ
اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ ؕ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ

ایک اونچی عمارت بنادو کہ میں اطراف میں پہنچوں، آسمانوں کے اطراف میں، پھر موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں تو اِسے ایک جھوٹا آدمی سمجھتا ہوں۔ اِس طرح فرعون کی نگاہوں میں اُس کی بد عملی خوش نما بنا دی گئی اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔ (یہ اُس نے ایک تدبیر کی تھی) اور فرعون کی یہ تدبیر بھی غارت ہو کر رہی۔ ۳۶-۳۷

اُس شخص نے، جو ایمان لے آیا تھا، (اِس پر بھی اپنی بات جاری رکھی اور) کہا: میری قوم کے لوگو، تم میری پیروی کرو، میں تمھیں سیدھی راہ دکھادوں گا۔[۱۳۰] اے میری قوم، یہ دنیا کی زندگی تو چند دن کا سامان ہے، حقیقت یہ ہے کہ اصل ٹھیرنے کی جگہ آخرت ہی ہے۔ اور (وہاں ضابطہ یہ ہے کہ) جو برائی کرے گا، وہ تو اُسی کے برابر بدلہ پائے گا، مگر جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو یہی لوگ ہیں جو بہشت میں داخل ہوں گے، جس میں وہ بے حساب رزق پائیں گے۔ میری قوم کے لوگو، کیا ماجرا ہے، میں تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی دعوت دے رہے ہو![۱۳۱] تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں خدا سے کفر کروں

۱۳۰۔ اوپر یہی بات فرعون نے کہی تھی۔ یہ ٹھیک اُس کا جواب ہے۔

۱۳۱۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون نے اُن کی تقریر میں مداخلت کی، اُسی طرح اُس کے

وَاُشۡرِكَ بِهٖ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ وَّاَنَا اَدۡعُوۡكُمۡ اِلَى الۡعَزِيۡزِ الۡغَفَّارِ ﴿٤٢﴾ لَا
جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَيۡهِ لَيۡسَ لَهٗ دَعۡوَةٌ فِى الدُّنۡيَا وَلَا فِى الۡاٰخِرَةِ وَاَنَّ
مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ هُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ ﴿٤٣﴾ فَسَتَذۡكُرُوۡنَ مَاۤ
اَقُوۡلُ لَـكُمۡ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمۡرِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿٤٤﴾

اور اُن چیزوں کو اُس کا شریک ٹھیراؤں جن کا مجھے کوئی علم نہیں ہے[١٣٢] اور میں تمھیں خداے عزیز و غفار کی طرف بلا رہا ہوں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جن کی دعوت تم مجھے دے رہے ہو، اُن کو نہ دنیا میں پکارنے کا کوئی فائدہ ہے، نہ آخرت میں،[١٣٣] اور یہ بھی کہ ہم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے اور یہ بھی کہ جو زیادتی کرنے والے ہیں،[١٣٤] وہی دوزخ کے لوگ ہوں گے۔ سو جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں، عنقریب تم اُسے یاد کرو گے۔[١٣٥] میں اپنا معاملہ اب اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

بعض اعیان واکابر نے بھی مداخلتیں کیں اور غالباً کچھ استدلال کرنے اور اُنھیں آباواجداد کے دین پر قائم رکھنے کی کوشش بھی کی۔ فرعون کی مداخلت کا تو اُنھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا، لیکن اِن اعیان واکابر کو جواب دیا ہے اور نہایت ہم دردی اور دل سوزی کے ساتھ دیا ہے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہو گی کہ فرعون سے اُنھیں کسی خیر کی امید نہیں تھی۔

١٣٢۔ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرک اور کفر میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...جو شخص خدا کے شریک ٹھیراتا ہے، وہ درحقیقت اُس کا کفر کرتا ہے، اِس لیے کہ دین میں خدا کا صرف مان لینا مطلوب نہیں ہے، بلکہ اُس کی تمام صفات اور اُس کے تمام حقوق کے ساتھ ماننا معتبر ہے اور اِن حقوق میں سب سے بڑا حق اُس کی توحید و یکتائی کا تسلیم کرنا ہے۔“(تدبرقرآن ٧/ ٤٦)

١٣٣۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَيۡسَ لَهٗ دَعۡوَةٌ'۔ اِن میں فعل کی نفی اُس کے فائدے کی نفی کے پہلو سے ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

١٣٤۔ یعنی خدا کے شریک ٹھیرا کر اپنی جان پر زیادتی کرنے والے ہیں۔

١٣٥۔ یعنی اُس وقت، جب خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے گا، خواہ وہ دنیا میں صادر ہو یا آخرت میں۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوۡا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ ۚ ﴿۴۵﴾
اَلنَّارُ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ ۟ اَدۡخِلُوۡٓا اٰلَ
فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ﴿۴۶﴾

یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگران ہے۔ ۳۸-۴۴

چنانچہ اُس کو تو اللہ نے اُن کی تدبیروں کے شر سے بچا لیا،[۱۳۶] مگر فرعون والوں کو (اِس کے بعد) برے عذاب نے گھیر لیا۔[۱۳۷] دوزخ کی آگ کہ جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں،[۱۳۸] اور جس دن قیامت برپا ہو گی، حکم دیا جائے گا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب میں داخل کرو۔ ۴۵-۴۶

۱۳۶۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اِس تقریر کے بعد فرعون اور اُس کے اعیان اُن کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں لگ گئے کہ کسی طرح وہ اپنے موقف سے دست بردار ہو کر واپس باپ دادا کے دین پر آ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت فرمائی اور وہ اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے۔ یہ حفاظت و نصرت اُن کو اِس لیے میسر ہوئی کہ جن حالات میں اور جس موقع پر اُنھوں نے اعلان حق کیا، اُس نے اُنھیں بھی ایک درجے میں گویا اُسی منصب پر کھڑا کر دیا جو رسولوں کے لیے خاص ہے۔ سورۂ یٰس میں 'فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ'* کے الفاظ سے ہماری اِس بات کی تائید ہوتی ہے۔

۱۳۷۔ یعنی پہلے غرقابی اور اُس کے بعد برزخ کی اذیت، جس کی طرف آگے اشارہ کیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'حَاقَ' کا لفظ اِس بات کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے کہ اِس عذاب نے اُن کو اِس طرح احاطے میں لے لیا کہ اُن کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

۱۳۸۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا معاملہ ایسا واضح ہو، جیسا کہ فرعونیوں کا تھا، اُن پر مرنے کے بعد ہی اُن کے اعمال کے اعتبار سے کیفیات کا صدور ہونے لگتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا حساب پوچھنے اور اُن کے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روایتوں میں اِسی کو عذاب قبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیکوکاروں کے لیے بھی یہی قاعدہ ہے۔ چنانچہ راہ حق کے شہیدوں کے متعلق فرمایا ہے کہ 'اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ، يُرۡزَقُوۡنَ'** (وہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں، اُنھیں روزی مل رہی ہے)۔

---

* ۳۶: ۱۴۔ "پھر ہم نے ایک تیسرے شخص سے اُس کی تائید کی۔"

** آل عمران ۳: ۱۶۹۔

وَاِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا
لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ
اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ فِی
النَّارِ لِخَزَنَۃِ جَہَنَّمَ ادۡعُوۡا رَبَّکُمۡ یُخَفِّفۡ عَنَّا یَوۡمًا مِّنَ الۡعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوۡۤا
اَوَلَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ؕ قَالُوۡا فَادۡعُوۡا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا
الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

اُس دن کا خیال کرو، جب یہ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے تو جو کم زور تھے، وہ اُن سے جو بڑے بنے رہے، کہیں گے کہ ہم تمھارے تابع تھے، پھر کیا آپ لوگ اِس آگ کا کچھ حصہ بھی ہم سے بٹائیں گے؟ وہ جو بڑے بنے رہے، جواب دیں گے: اب تو ہم سب اِسی میں ہیں۔ اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے۔[139] (چنانچہ ہر طرف سے مایوس ہو کر) یہ آگ میں پڑے ہوئے لوگ دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں سے کسی ایک دن کی تخفیف کر دے۔ وہ جواب دیں گے: کیا تمھارے پاس تمھارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے تھے؟ وہ اعتراف کریں گے کہ ہاں، آتے تو ضرور رہے۔ داروغے کہیں گے: پھر تم ہی درخواست کرو اور منکروں کی پکار (اُس دن) بالکل صدا بہ صحرا ثابت ہو گی۔[140] ۴۷-۵۰

۱۳۹۔ مطلب یہ ہے کہ نہ ہمارے مزعومات کی رعایت ہوئی اور نہ تمھارا یہ عذر مسموع ہوا کہ تم ہمارے دباؤ میں تھے۔ اللہ نے ٹھیک حق و عدل کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دیا ہے اور اب ہم سب اپنے کرتوتوں کے نتائج بھگتنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔ اِس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہر شخص، خواہ وہ کتنا ہی دبا ہوا ہو، ایمان و اسلام کا مکلف ہے۔ وہ یہ ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر سبک دوش نہیں ہو سکتا۔

۱۴۰۔ یعنی نہ اُن کے مزعومہ دیوی دیوتا اُن کی فریاد سنیں گے، نہ مذہب و سیاست کے پیشوا کچھ کام آئیں گے

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَی الْهُدٰی وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًی
وَّذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ

(ہم نے جس طرح موسیٰ کی مدد کی)، یقین رکھو، ہم اپنے رسولوں کی اور اُن پر ایمان لانے والے اُن کے ساتھیوں کی (اُسی طرح) دنیا کی زندگی میں بھی لازماً مدد کرتے ہیں[۱۴۱] اور اُس دن بھی کریں گے، جب گواہ کھڑے ہوں گے۔[۱۴۲] جس دن (خدا کے شریک ٹھیرا کر) اپنی جان پر ظلم کرنے والوں کو اُن کی معذرت کچھ بھی نفع نہ دے گی اور اُن پر لعنت پڑے گی اور اُن کے لیے بہت برا ٹھکانا ہو گا۔ ۵۱-۵۲

(چنانچہ دیکھ سکتے ہو کہ فرعون غرقاب ہوا اور) ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور عقل والوں کی رہنمائی اور یاددہانی کے لیے بنی اسرائیل کو اپنی کتاب[۱۴۳] کا وارث بنا دیا تھا۔ اِس لیے ثابت قدم رہو، (اے پیغمبر)، یقیناً اللہ کا وعدہ برحق ہے۔[۱۴۴] اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے

اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ شنوائی ہو گی۔ امید کے تمام دروازے اُن کے لیے اُس دن بند ہو جائیں گے۔

۱۴۱۔ رسول اور اُس کے ساتھیوں کے لیے یہی سنت الٰہی ہے کہ اُن کے لیے خدا کی نصرت دنیا میں بھی لازماً آتی ہے اور اُن کے مخالفین تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ آیت میں 'الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ اِنھی ساتھیوں کے لیے آئے ہیں۔ ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ اِس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں۔

۱۴۲۔ یعنی قیامت کے دن۔ یہ گواہ خدا کے پیغمبر بھی ہوں گے، اُس کے فرشتے بھی اور ذریت ابراہیم کے لوگ بھی جو خدا کی طرف سے اِس منصب پر فائز کیے گئے۔ اِس کی تفصیلات دوسرے مقامات میں بیان ہو چکی ہیں۔

۱۴۳۔ یعنی تورات کا۔

۱۴۴۔ یہ اُسی وعدے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ بِالۡعَشِيِّ وَالۡاِبۡكَارِ ﴿۵۵﴾

رہو[۱۴۵] اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے رہو۔ ۵۳-۵۵

ثابت قدم رہیں۔ جو حشر فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کا ہوا تھا، وہی قریش کے اِن فراعنہ کا بھی ہونا ہے۔ اِن میں سے اگر کوئی اپنی قوم کا حقیقی خیر خواہ ہے تو اُسے اُس بندۂ مومن کی مثال سامنے رکھنی چاہیے جس نے فرعون کے دربار میں اعلان حق کیا تھا۔ لیکن اِن کے رویے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے ایک ایک شخص اپنا سارا زور قوم کو عذاب الٰہی کی طرف دھکیلنے میں صرف کر رہا ہے۔ لٰہذا مطمئن رہو، خدا کا فیصلہ عنقریب صادر ہونے والا ہے۔ اہل ایمان کے لیے، اُس کے بعد، خدا کی مدد پوری شان کے ساتھ ظاہر ہو گی اور یہ اُسی انجام کو پہنچ جائیں گے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔

۱۴۵۔ یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن تبعاً آپ کے پیرو بھی اِس میں شامل ہیں۔ خطاب کا یہ اسلوب قرآن میں جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ ہدایت پوری جماعت کے لحاظ سے ہے۔ اِس میں گناہوں کے لفظ سے کسی کو متوحش نہیں ہونا چاہیے۔

[باقی]

حدیث سیل

ترجمہ وتدوین: شاہد رضا

دن کی نفل نمازیں

عن عاصم بن ضمرة السلولي، قال: سألنا عليًا رضي الله عنه عن تطوع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالنهار، فقال: إنكم لا تطيقونه. فقلنا: أخبرنا به نأخذ منه ما استطعنا. قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا صلى الفجر، يمهل حتى إذا كانت الشمس من هاهنا، يعني من قبل المشرق بمقدارها من صلاة العصر من هاهنا، يعني من قبل المغرب. قام فصلى ركعتين. ثم يمهل حتى إذا كانت الشمس من هاهنا، يعني من قبل المشرق مقدارها من صلاة الظهر من هاهنا قام فصلى أربعًا وأربعًا قبل الظهر إذا زالت الشمس وركعتين بعدها وأربعًا قبل العصر يفصل بين كل ركعتين بالتسليم على الملائكة المقربين والنبيين ومن تبعهم من المسلمين والمؤمنين. قال علي: فتلك ست عشرة ركعة تطوع رسول الله صلى الله عليه وسلم

بالنهار وقل من يداوم عليها.

عن أم سلمة قالت: دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد العصر فصلى ركعتين. فقلت: يا رسول الله، ما هذه الصلاة، ما كنت تصليها؟ قال: «قدم وفد بني تميم فحبسوني عن ركعتين أركعهما بعد الظهر».

حضرت عاصم بن ضمرہ سلولی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دن کی نفل نماز کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: تم ان کو ادا نہ کر سکو گے[1]، ہم نے کہا کہ آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیے، ہم ان میں سے جتنی ادا کر سکیں گے، اتنی لے لیں گے۔ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر پڑھنے کے بعد رکے رہتے، یہاں تک کہ جب سورج مشرق کی جانب سے اتنا بلند ہو جاتا، جتنا کہ عصر کے وقت مغرب کی جانب سے ہوتا ہے تو کھڑے ہوتے اور دو رکعت (نفل) ادا فرماتے، پھر ٹھیر جاتے، یہاں تک کہ جب سورج مشرق کی جانب سے اتنا بلند ہو جاتا، جتنا ظہر کے وقت مغرب کی طرف سے بلند ہوتا ہے تو آپ کھڑے ہوتے اور چار رکعت پڑھتے، اور جب سورج ڈھل جاتا تو نماز ظہر سے پہلے چار رکعت (نفل) اور اس کے بعد دو رکعت پڑھتے، اور چار رکعت عصر سے پہلے، جن میں ہر دو رکعتوں کے درمیان مقرب فرشتوں، انبیاے کرام اور ان کے پیروکار مسلمانوں اور مومنوں پر سلام بھیج کر[2] فصل کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہ سب سولہ نفل رکعتیں ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت ادا فرماتے، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو مداومت کے ساتھ انھیں ادا کرتے رہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس نماز عصر کے بعد تشریف لائے اور دو رکعات نماز ادا فرمائی۔ میں نے عرض کیا:

یارسول اللہ، یہ کون سی نماز ہے جو آپ نے ادا کی ہے، آپ نے یہ نماز کبھی ادا نہیں فرمائی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: میرے پاس قبیلۂ تمیم کا وفد آیا تھا اور انھوں نے مجھے روکے رکھا، جس کی وجہ سے میری وہ دو رکعتیں چھوٹ گئی تھیں جنھیں میں (عموماً) ظہر کے بعد ادا کرتا تھا، (لہٰذا میں نے وہی دو رکعتیں اب ادا کی ہیں)[۳]۔

حواشی کی توضیح

۱۔ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ سوال سنا تو ان کی جانب سے یہ توضیح ایک فطری امر تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی پیروی کے لیے جاننا چاہتا ہے۔ اسی لیے انھوں یہ کہہ کر جواب دیا کہ سائل کو اتنی طاقت نہیں ہو گی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی نفل نمازیں ادا کر سکے۔

۲۔ سلام بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز مکمل ہو چکی ہے۔ اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو دو کر کے چار رکعات ادا فرماتے۔

۳۔ یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل عبادات میں مستقل مزاجی کے حوالے سے بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس روایت کے مطابق، ایک دفعہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دو نفلی رکعتیں چھوٹ گئیں جو آپ باقاعدہ ادا کرتے تھے، قبیلۂ تمیم کے وفد کے ساتھ مصروفیت سے فراغت کے بعد آپ نے انھیں فوری طور پر ادا فرمایا۔

متون

پہلی روایت بعض اختلافات کے ساتھ ابن ماجہ، رقم ۱۱۶۱؛ ترمذی، رقم ۵۹۸، ۵۹۹؛ احمد، رقم ۶۵۰، ۱۲۰۲، ۱۲۰۷، ۱۳۷۵؛ نسائی، رقم ۸۷۴، ۸۷۵؛ السنن الکبریٰ، رقم ۳۴۱-۳۳۷، ۴۰۷؛ بیہقی، رقم ۴۲۶۸، ۴۶۹۳-۴۶۹۴؛ ابو یعلیٰ، رقم ۳۱۶، ۶۲۲؛ عبد الرزاق، رقم ۴۸۰۶-۴۸۰۷ اور ابن خزیمہ، رقم ۱۲۳۲ میں روایت کی گئی ہے۔

دوسری روایت بعض اختلافات کے ساتھ ابن خزیمہ، رقم ۱۲۷۷؛ احمد، رقم ۲۶۵۵۸، ۲۶۷۲۰، ۲۶۸۷۵، ۲۶۸۸۲؛ بیہقی، رقم ۴۳۳۷؛ ابو یعلیٰ، رقم ۶۹۴۶، ۷۰۸۵؛ السنن الکبریٰ، رقم ۳۵۰، ۱۵۵۶-۱۵۵۸ اور

مسند عبد ابن حمید، رقم ۱۵۳۱ میں روایت کی گئی ہے۔

پہلی روایت

بعض روایات، مثلاً نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۳۳۷ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نمازوں کے اوقات قدرے مختلف الفاظ میں بیان ہوئے ہیں:

إذا زالت الشمس، يعني من مطلعها.

”جب سورج ڈھل جاتا، یعنی مطلع سے۔“

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۱۲۰۷ میں سیدنا علی اور حضرت عاصم رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والا مکالمہ درج ذیل الفاظ میں مختصر طور پر روایت کیا گیا ہے:

عن عاصم بن ضمرة، قال: سألنا عليًا رضي الله عنه عن تطوع النبي صلى الله عليه وسلم بالنهار، قال: قال علي: تلك ست عشرة ركعة تطوع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالنهار وقل من يداوم عليها.

”حضرت عاصم بن ضمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دن کی نفل نماز کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: یہ سب سولہ نفل رکعتیں ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت ادا فرماتے، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو مداومت کے ساتھ انھیں ادا کرتے رہیں۔“

بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۸۷۵ میں یہ مضمون درج ذیل مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے:

عن عاصم بن ضمرة، قال: سألت علي بن أبي طالب عن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم في النهار قبل المكتوبة، قال: من يطيق ذلك؟ ثم أخبرنا قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي حين تزيغ الشمس ركعتين وقبل نصف النهار

”حضرت عاصم بن ضمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرض نماز سے پہلے کی دن کی (نفل) نماز کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: اسے (مداومت کے ساتھ) ادا کرنے کی کون طاقت رکھتا ہے؟ پھر ہمیں یہ بتاتے ہوئے جواب دیا:

أربع ركعات يجعل التسليم في آخره.

جب سورج ڈھل جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتیں اور نصف النہار سے پہلے چار رکعات (نفل) ادا فرماتے اور ان رکعات کے آخر میں سلام پھیرتے۔“

دوسری روایت

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۴۳۳۷ میں ’قدم وفد بني تميم فحبسوني عن ركعتين أركعهما بعد الظهر‘ (میرے پاس قبیلۂ تمیم کا وفد آیا تھا اور انھوں نے مجھے روکے رکھا، جس کی وجہ سے میری وہ دو رکعتیں چھوٹ گئی تھیں جنھیں میں (عموماً) ظہر کے بعد ادا کرتا تھا، (لہٰذا میں نے وہی دو رکعتیں اب ادا کی ہیں)) کے بجاے ’كنت أصليهما بعد الظهر فجاءني مال فشغلني عنهما فصليت الآن‘ (میں یہ دو رکعات ظہر کے بعد ادا کرتا تھا، پھر میرے پاس کچھ مال آیا اور اس نے مجھے مشغول کر دیا، جس کی وجہ سے وہ دو رکعتیں (وقت پر ادا کرنے سے) رہ گئیں۔ لہٰذا وہ میں نے اب ادا کی ہیں) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

اس روایت سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مساکین کے لیے بطور صدقہ مال آیا تھا، جس کی تقسیم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصروف ہو گئے تھے۔ یہ پہلو احمد، رقم ۲۶۸۸۲ میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض روایات، مثلاً ابو یعلیٰ، رقم ۶۹۴۶ میں روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’كنت أصليهما قبل العصر‘ (میں یہ دو رکعات نماز عصر سے پہلے پڑھتا تھا)۔

بعض روایات، مثلاً ابن خزیمہ، رقم ۱۲۷۷ میں ’فحبسوني عن‘ (انھوں نے مجھے اس سے روکے رکھا) کے بجاے ان کے مترادف الفاظ ’فشغلوني عن‘ (انھوں نے اس سے مجھے مشغول کر دیا) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۲۶۸۷۵ میں یہ مضمون قدرے مختلف انداز میں روایت کیا گیا ہے:

عن ميمونة، زوج النبي صلى الله عليه وسلم، أن النبي صلى الله عليه وسلم فاتته ركعتان قبل العصر فصلاهما بعد.

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دو رکعتیں چھوٹ گئیں جنھیں آپ نماز عصر سے پہلے ادا فرماتے تھے، لہٰذا آپ نے وہ دو رکعتیں نماز عصر کے بعد ادا فرمائیں۔“

بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۵۷۴ سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل غلط طور پر روایت کیا گیا ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم السجدتين بعد العصر عندي قط.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاں نماز عصر کے بعد کبھی دو رکعتیں ترک نہیں فرمائیں۔“

بہ ظاہر غلط طور پر کی گئی یہ روایت نسائی، رقم ۵۷۵-۵۷۹ اور نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۵۳-۱۵۵۶ میں بھی روایت کی گئی ہے۔

نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۵۴ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بارے میں زیادہ عام بیان پیش کیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ما دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد صلاة إلا صلاهما.

”جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد میرے پاس تشریف لاتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دو رکعات ادا فرماتے۔“

نسائی، رقم ۵۷۷ میں روایت کے متن میں قدرے اضافہ بیان ہوا ہے:

عن عائشة، قالت: صلاتان ما تركهما رسول الله صلى الله عليه وسلم في بيتي سرًا وعلانية: ركعتان قبل الفجر وركعتان بعد العصر.

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: دو نمازیں ایسی ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں خفیہ اور علانیہ کبھی ترک نہیں کیا: دو رکعات نماز فجر سے پہلے اور دو رکعات نماز عصر کے بعد۔“

متذکرہ بالا روایتوں کی روایت میں غلط فہمی کا ثبوت نسائی، رقم ۵۷۸ سے بھی ملتا ہے، جس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی درج ذیل الفاظ میں وضاحت کر دی ہے:

عن أبي سلمة أنه سأل عائشة عن السجدتين اللتين كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصليهما بعد العصر، فقالت: إنه كان يصليهما

”حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان دو رکعات کے بارے میں سوال کیا جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر کے بعد ادا

قبل العصر ثم إنه شغل عنهما أو نسيهما فصلاهما بعد العصر وكان إذا صلى صلاة أثبتها.

فرماتے تھے۔ سیدہ عائشہ نے جواب دیا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دو رکعتیں نماز عصر سے پہلے ادا کرتے تھے، پھر (کسی وجہ سے) آپ مشغول ہو گئے اور رہ گئیں یا آپ انھیں ادا کرنا بھول گئے، اس لیے آپ نے یہ دو رکعتیں عصر کے بعد ادا فرمائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی (نفل) نماز ادا کرتے تو اسے مستقل مزاجی کے ساتھ ادا کرتے۔''

نسائی، رقم ۵۷۹ کے مطابق، یہ واقعہ صرف ایک دفعہ ہی پیش آیا ہے کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ دو رکعتیں نہ ادا کر سکے جنھیں آپ عموماً نماز ظہر کے بعد ادا فرماتے تھے۔

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

میزان — توضیحی مطالعہ

اصول و مبادی

(۲)

مبادی تدبر قرآن

اس باب میں مصنف نے دس عنوانات کے تحت قرآن مجید کے متن کے تاریخی استناد، زبان و بیان، طرز کلام، مذہبی و تاریخی پس منظر، بنیادی مضمون اور آسمانی کتابوں میں قرآن کی خاص حیثیت سے متعلق کئی اہم پہلوؤں کی وضاحت کی ہے، جنھیں ملحوظ رکھنا قرآن مجید پر علمی طریقے پر غور کرنے کے لیے مصنف کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ زیر نظر سطور میں ایک مناسب ترتیب سے ان امور کا ایک توضیحی و تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

قرآن مجید کا متن

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے یہ قرآن جس طرح آپ کو دیا جا رہا ہے، اِس کے دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے، لیکن اِس سے آپ کو اِس کی حفاظت اور جمع و ترتیب کے بارے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ اِس کی جو قراءت اِس کے زمانۂ نزول میں اِس وقت کی جا رہی ہے، اِس

کے بعد اِس کی ایک دوسری قراءت ہو گی۔ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اِس میں سے کوئی چیز اگر ختم کرنا چاہیں گے تو اُسے ختم کرنے کے بعد یہ آپ کو اِس طرح پڑھا دیں گے کہ اِس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا اور اپنی آخری صورت میں یہ بالکل محفوظ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔‘‘(میزان ۲۷)

’’قرآن، جیسا کہ اِس بحث کی ابتدا میں بیان ہوا، اِس معاملے میں بالکل صریح ہے کہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات مرتب ہوا ہے، لیکن یہ [سیدنا صدیق اور سیدنا عثمان کے دور میں قرآن کی جمع و تدوین کی] روایتیں اِس کے برخلاف ایک دوسری ہی داستان سناتی ہیں جسے نہ قرآن قبول کرتا ہے اور نہ عقل عام ہی کسی طرح ماننے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔‘‘(میزان ۳۱)

ان دو اقتباسات میں سے پہلے اقتباس میں مصنف نے سورۂ قیامہ اور سورۂ اعلیٰ کی درج ذیل آیات کی روشنی میں قرآن کے نزول اور اس کی جمع و تدوین کی خدائی اسکیم کی وضاحت کی ہے۔

سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ.(۷۵: ۱۷-۱۸)

’’بے شک، ہمارے ذمے ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو پڑھ کر سنانا۔ پھر جب ہم اس کو پڑھ کر سنائیں تو تم اس پڑھے جانے والے کی پیروی کرو۔‘‘

سورۂ اعلیٰ میں فرمایا ہے:

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى.(۸۷: ۶)

’’جلد ہم تمھیں پڑھائیں گے اور پھر تم نہیں بھولو گے۔‘‘

مصنف کی ذکر کردہ تشریح کے مطابق ان آیات میں قرآن مجید کے تدریجی نزول، ابتدائی قراءت کے بعد ایک دوسری قراءت اور اس کی روشنی میں متن کی جمع و ترتیب، نیز حسب ضرورت قرآن کی آیات کی توضیح و تبیین سے متعلق پوری اسکیم بیان کی گئی ہے۔ اس اسکیم کی رو سے قرآن کے متن کی جمع و ترتیب کے تمام مراحل کا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مکمل ہونا ضروری تھا۔ روایات کے مطابق جبریل علیہ السلام نے آپ کی زندگی کے آخری رمضان میں دو مرتبہ آپ کو قرآن پڑھ کر سنایا، جسے ’’عرضۂ اخیرہ کی قراءت‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہی قرآن کا آخری اور حتمی متن تھا جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قراء صحابہ کو دی اور اللہ کی ہدایت کے مطابق قرآن کے متن مکمل اور مرتب صورت میں صحابہ کے سپرد کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔

قرآن مجید کے مذکورہ بیانات کی روشنی میں، دوسرے اقتباس میں مصنف نے ان روایات پر تنقید کی ہے

جن میں سیدنا ابو بکر اور پھر سیدنا عثمان کے زمانے میں قرآن مجید کی جمع وتدوین کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں بنیادی روایتیں صحیح بخاری میں محمد بن مسلم ابن شہاب زہری کے واسطے سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں۔

سیدنا صدیق کے عہد میں جمع قرآن سے متعلق روایت میں زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ یمامہ میں قرآن کے بہت سے قاریوں کے شہید ہو جانے پر سیدنا عمر نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ قاریوں کے ساتھ ہی قرآن کے متن کا بہت بڑا حصہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے سیدنا صدیق اکبر کو قرآن کا متن جمع کرنے پر آمادہ کیا اور ان دونوں کی ہدایت پر زید بن ثابت نے لوگوں کے سینوں میں محفوظ اور مختلف چیزوں پر لکھے ہوئے قرآن کے اجزا کو تلاش کر کے جمع کیا اور ان اوراق کو سیدنا ابو بکر کی تحویل میں دے دیا۔ اس سرگرمی کے دوران میں زید بن ثابت کو سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں انھیں صرف ابو خزیمہ انصاری کے پاس ملیں اور ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے پاس یہ آیات موجود نہیں تھیں (بخاری، رقم ۴۷۰۱)۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قرآن کو جمع کرنے کا واقعہ زید بن ثابت کی زبانی یوں بیان ہوا ہے کہ اس موقع پر جب وہ مصحف کو نقل کر رہے تھے تو سورۂ احزاب کی ایک آیت جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے تھے، انھیں مصحف میں نہیں ملی۔ چنانچہ انھوں نے اسے تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس مل گئی اور اسے سورۂ احزاب میں شامل کر لیا گیا۔ وہ آیت یہ تھی: 'مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ' (بخاری، رقم ۴۷۰۲)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قرآن کی جمع وترتیب مکمل ہو جانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کو از سر نو قرآن کے متن کی تحقیق اور جمع وترتیب کی ضرورت نہ ہو، جب کہ مذکورہ روایات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن مجید کے متن کی تلاش اور جمع وترتیب کا مسئلہ حل طلب تھا، جسے ان دونوں خلفا کے زمانے میں طے کرنے کی کوشش کی گئی اور صحابہ کے پاس موجود تحریری ریکارڈ اور گواہیوں کی روشنی میں قرآن کے متن کو مرتب کیا گیا۔

مستشرقین کی ایک جماعت نے، جن میں نولدیکے، رچرڈ بیل، مار گولیتھ، آرتھر جیفرے اور منٹگمری واٹ وغیرہ شامل ہیں، ان روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اپنی وحی کو محفوظ یا مرتب کرنا نہیں تھا اور انھوں نے اپنی زندگی میں اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا، اس لیے جب ان کی وفات ہوئی تو

قرآن کا متن منتشر حالت میں تھا، جس کے کچھ اجزا بعض لوگوں کو زبانی یاد تھے اور کچھ متفرق اشیا پر لکھے ہوئے تھے۔ اس کو جمع اور محفوظ کرنے کی ضرورت بنیادی طور پر آپ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو محسوس ہوئی اور انھوں نے اس سلسلے میں مختلف کوششیں کیں، لیکن یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کوششوں کے نتیجے میں قرآن کا سارا متن محفوظ کر لیا گیا۔[1]

مسلمان اہل علم کا نقطۂ نظر اس معاملے میں یہ رہا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن ایک مصحف میں جمع نہیں تھا اور اس کی وجہ وہ عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں چونکہ وحی کے نزول کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے آپ قرآن کی زبانی تعلیم کے علاوہ اس کے اجزا کو متفرق اوراق اور پارچوں میں لکھوانے کا اہتمام تو فرماتے تھے، لیکن آپ نے اسے ایک مصحف میں جمع نہیں کیا (زرکشی، البرہان فی علوم القرآن ۱۶۵۔ ابن حجر، فتح الباری ۹/ ۱۳)۔ تاہم ایک مصحف میں جمع نہ ہونے کے باوجود قرآن کا حتمی متن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی طے ہو چکا تھا اور آپ مکمل اور مرتب شکل میں امت کو اس کی تعلیم دے کر دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ آپ کی تعلیم و تلقین کے مطابق قرآن کی تمام سورتیں اپنے مخصوص ناموں کے ساتھ از اول تا آخر صحابہ کو معلوم تھیں، اور پورا قرآن حفاظ صحابہ کے سینوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ مختلف اوراق اور اشیا پر بھی لکھا ہوا موجود تھا۔

سیدنا ابو بکر کے عہد میں جب بہت سے حفاظ کی شہادت کے پس منظر میں قرآن کے متن کے ضائع ہو جانے کا خدشہ سامنے آیا تو اسے ایک مصحف کی صورت میں یکجا کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس موقع پر صحابہ کو اصولاً قرآن کا متن جمع کرنے کے لیے از سر نو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ معلوم و معروف تھا۔ تاہم احتیاط کے پہلو سے اور اتفاق رائے پیدا کرنے کے پیش نظر صحابہ سے یہ کہا گیا کہ جس کے پاس قرآن کا جو بھی جزو زبانی یا تحریری طور پر محفوظ ہو، وہ اسے لے آئے۔ اس کے ساتھ ان سے دو گواہ بھی طلب کیے گئے، جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ سارا عمل علیٰ رؤوس الاشہاد انجام پائے اور بعد میں کسی کو کوئی شبہ یا اعتراض اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کے متن کو جمع یا مرتب کے لیے فی نفسہٖ کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی اور نہ اس تحقیق کے لیے انفرادی گواہیوں پر انحصار کیا گیا، کیونکہ وہ مکمل اور مرتب صورت میں پہلے ہی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر حافظ محمود اختر، حفاظت قرآن اور مستشرقین، ص ۲۰۳ - ۲۱۷۔ ڈاکٹر شہزاد سلیم، History of the Qur’an، ص ۲۵-۲۸۔

صحابہ کو معلوم اور حفظاً وکتابۃً اُن کے پاس موجود تھا۔

باقلانی نے جمع قرآن کی نوعیت کی وضاحت میں لکھا ہے:

أنهم لم يثبتوا منه شيئًا غير معروف، ولا ما تقم الحُجة به، ولا أجمعوا في العلم بصحة شيء منه وثبوته إلى شهادة الواحد والاثنين ومن جرى مجراهما، وإن كانوا قد أشهدوا على النسخة التي جمعوها على وجه الاحتياط من الغلط، وطريق الحكم والإنفاذ. (الانتصار للقرآن ۱/ ۶۴)

”صحابہ نے مصحف میں کوئی ایسی چیز درج نہیں کی جو معروف نہیں تھی اور جس کے ثبوت پر حجت قائم نہیں ہو چکی تھی۔ اسی طرح انھوں نے قرآن کے کسی حصے کی صحت اور ثبوت معلوم کرنے کے لیے ایک یا دو گواہوں یا ان کے قائم مقام کسی شہادت پر اتفاق نہیں کیا۔ ہاں، جو نسخہ انھوں نے جمع کیا، اس میں ممکنہ غلطی سے بچنے اور لوگوں کو اس نسخے کا پابند بنانے کے لیے ضرور اس پر گواہی لینے کا اہتمام کیا۔“

زرکشی لکھتے ہیں:

وإنما طلب القرآن متفرقًا ليعارض بالمجتمع عند من بقي ممن جمع القرآن ليشترك الجميع في علم ما جمع فلا يغيب عن جمع القرآن عنده منه شيء ولا يرتاب أحد في ما يودع المصحف ولا يشكوا في أنه جمع عن ملإ منهم. (البرہان فی علوم القرآن ۱۸۶)

”قرآن کے مختلف اجزا اس لیے اکٹھے کیے گئے تاکہ پورے قرآن کو یاد کرنے والے جو صحابہ موجود تھے، ان کے پاس جمع شدہ متن کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تاکہ جمع کردہ متن تمام لوگوں میں مشترک طور پر معلوم ہو جائے اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو کسی کے نزدیک قرآن میں شامل ہونے سے رہ گئی ہو۔ نیز مصحف میں درج متن پر کوئی بھی شک وشبہ نہ کر سکے اور نہ لوگوں کو اس بات میں کوئی شبہ ہو کہ مصحف تمام صحابہ کے اتفاق سے مرتب کیا گیا ہے۔“

ابن عقیلہ، حارث محاسبی کے بیان کی روشنی میں واضح کرتے ہیں کہ اس ساری سرگرمی میں بنیادی انحصار صحابہ کے انفرادی بیانات یا ان کے پاس موجود تحریری مواد پر نہیں، بلکہ قرآن کے معلوم ومعروف متن پر تھا،

جو مجموعی طور پر پوری جماعت صحابہ کے پاس محفوظ تھا۔ لکھتے ہیں:

قال: فإن قيل: كيف وقعت الثقة بأصحاب الرقاع، وصدور الرجال؟ قيل: لأنهم كانوا يبدون عن تأليف معجز، ونظم معروف قد شاهدوا تلاوته من النبي ﷺ عشرين سنة، فكان تزوير ما ليس منه مأمونًا، وإنما كان الخوف من ذهاب شيء من صحفه. انتهى. وأيضًا فكانوا جماعة من الصحابة قد جمعوه في حفظهم، منهم: زيد بن ثابت؛ فكان أخذهم لما في الرقاع والصدور تأكيدًا لما عندهم، فالزيادة فيه والنقص مأمونة.

(الزيادة والاحسان فی علوم القرآن ۲/۲۲)

”(حارث محاسبی کہتے ہیں کہ) اگر یہ پوچھا جائے کہ جن کے پاس قرآن کے اجزا لکھے ہوئے یا سینوں میں موجود تھے، ان پر اعتماد کس بنیاد پر کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ ایک معجز کلام اور ایک معروف و معلوم متن کو جمع کر رہے تھے، جس کی تلاوت کرتے ہوئے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیس سال تک دیکھا تھا۔ اس لیے کوئی چیز گھڑ کر قرآن میں شامل کر دیے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا، بلکہ صرف یہ خدشہ تھا کہ (حفاظ کی وفات سے) اس کا کوئی جز ضائع نہ ہو جائے، جو لکھا ہوا نہیں ہے۔ (ابن عقیلہ کہتے ہیں کہ) اس کے علاوہ صحابہ کی ایک جماعت کو پورا قرآن زبانی بھی یاد تھا، جن میں زید بن ثابت بھی شامل تھے، اور صحابہ لوگوں کے پاس لکھا ہوا یا سینوں میں محفوظ کلام محض اس متن کی توثیق اور تاکید کے لیے جمع کر رہے تھے جو ان کے پاس موجود تھا۔ ایسی صورت میں متن میں کسی زیادتی یا کمی کا کوئی امکان نہیں تھا۔“

اس بنیادی نقطۂ نظر کے تحت مسلمان اہل علم ان روایات کا مفہوم بھی واضح کرتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات اکا دکا صحابہ کے بیان پر قرآن میں لکھی گئیں۔ ان کے سامنے سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کا ابلاغ عام کیوں نہیں کیا اور ان کے ثبوت کے لیے صحابہ کو انفرادی روایات پر کیوں انحصار کرنا پڑا؟ چنانچہ زرکشی نے اس روایت کو جس میں سورۂ احزاب کی ایک آیت کا خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کی شہادت پر قرآن میں درج کیے جانے کا ذکر ہے، اس پر محمول کیا ہے کہ یہ آیت اصولی طور پر زید

بن ثابت اور دیگر صحابہ نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، لیکن انھیں مستحضر نہیں رہی اور پھر خزیمہ کے یاد دلانے پر انھیں بھی یاد آگئی (البرہان ۱۶۵)۔

اسی طرح سورۂ براءۃ کی آخری آیتوں کے متعلق زید بن ثابت کے اس بیان کو کہ وہ مجھے خزیمہ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ملیں (لم أجدها مع غیره)، زرکشی ان صحابہ پر محمول کرتے ہیں جنھیں جزوی طور پر قرآن یاد تھا۔ یعنی جن صحابہ کو پورا قرآن حفظ تھا، ان کو تو یہ آیت یاد تھی، البتہ جزوی طور پر قرآن یاد کرنے والوں میں سے صرف ایک صحابی، یعنی خزیمہ نے یہ آیت یاد کی تھی (البرہان ۱۶۸)۔ ابن حجر کی رائے میں زید بن ثابت کی مراد لکھی ہوئی آیات کی نفی کرنا ہے، یعنی یہ آیتیں فی نفسہٖ تو محفوظ اور صحابہ کو یاد تھیں، لیکن لکھی ہوئی صورت میں خزیمہ کے علاوہ کسی کے پاس موجود نہیں تھیں (فتح الباری ۹/ ۱۳)۔

بعض معاصر اہل علم نے اس مفروضے پر بھی ان روایات کی توجیہ کی ہے کہ ان آیات کا علم واقعتاً انھی چند صحابہ کو تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ دراصل تواتر کی کوئی ایک ہی خاص شکل نہیں ہوتی، بلکہ مختلف حالتوں میں معاون قرائن کی روشنی میں راویوں کی مختلف تعداد سے کسی بات کے ثبوت کا یقین حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے میں مختلف روایات کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ براءۃ کی یہ دو آیتیں زبانی یا تحریری طور پر پانچ صحابہ کے پاس محفوظ تھیں اور چونکہ وضع کا کوئی محرک موجود نہیں تھا، اس لیے یہ بھی ان آیات کے یقینی ثبوت کے لیے کافی تھا۔ اس مفہوم میں یہ آیات بھی باقی قرآن کی طرح متواتر ہو جاتی ہیں (مصطفیٰ الاعظمی، النص القرآنی ۵۱-۵۲)۔

جمع قرآن کی روایات کے حوالے سے اہل علم کے اس روایتی نقطۂ نظر کے برخلاف، دور جدید میں متعدد اہل علم کے ہاں ایک دوسرا رجحان سامنے آیا ہے، جو زیر بحث روایات کی تاریخی صحت پر کئی پہلوؤں سے تنقیدی سوالات اٹھاتا ہے۔ اس ضمن میں اولین تنقید ''تاریخ القرآن'' کے مصنف مفتی عبد اللطیف رحمانی نے پیش کی ہے اور عہد صدیقی و عہد عثمانی میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قرآن کی جمع و تدوین سے متعلق صحیح بخاری کی معروف روایات پر متعدد سوالات اٹھاتے ہوئے انھیں ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ مستند روایات کے مطابق زید بن ثابت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پورا قرآن یاد کر لیا تھا، اس لیے سیدنا ابو بکر نے اگر انھیں قرآن کو جمع کرنے کی ذمہ داری دی تو اس کے لیے انھیں دیگر صحابہ کے سینوں اور مختلف چیزوں پر لکھے ہوئے اجزا کو اکٹھا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مزید یہ کہ روایت میں اس موقع پر زید بن ثابت ہی سارے کام میں پیش پیش دکھائی دیتے ہیں، جب کہ دیگر اکابر صحابہ بھی اس موقع پر موجود تھے

جنھیں اس ذمہ داری میں شریک کیا جانا چاہیے تھا۔

مولانا رحمانی یہ نکتہ بھی اٹھاتے ہیں کہ اول تو یمامہ میں حفاظ کی کوئی ایسی بڑی تعداد شہید نہیں ہوئی تھی جس سے قرآن کے ضائع ہو جانے کا خدشہ پیدا ہوتا ہو، اور اگر واقعی ایسا تھا تو پھر سیدنا ابو بکر کو جنگوں کا سلسلہ روک کر سب سے پہلے قرآن کو محفوظ کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے تھا، لیکن تاریخی طور پر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس خدشے کے غیر حقیقی ہونے کا اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ روایات کے مطابق زید بن ثابت کے جمع کردہ نسخے کو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں محفوظ کر لیا گیا اور اس کی اشاعت کی کوشش نہیں کی گئی، حالاں کہ مبینہ صورت حال میں اس کی عام اشاعت کی جانی چاہیے تھی۔ اس نوعیت کے مزید کئی نکات کی روشنی میں عہد صدیقی میں جمع قرآن کی روایت سے متعلق اپنا نتیجۂ تحقیق انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

"یہ عجب بات ہے کہ جو واقعہ نہایت ہی بے اصل اور سراسر غلط اور جس قدر بے بنیاد ہوتا ہے، اسی قدر مشہور اور زبان زد عوام و خواص ہو جاتا ہے۔ خلیفہ اول کے جمع قرآن کے واقعہ نے شہرت کا یہ درجہ پایا ہے کہ آج محدثین اور مورخین اور ہر مسلمان کی زبان اور قلم پر ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ بخاری جیسے ناقد اور محقق کی تحقیق کی روشنی بھی اس شہرت کے آگے ماند پڑ گئی۔" (تاریخ القرآن ۱۳۲)

سیدنا عثمان کے عہد میں مصحف کی تیاری سے متعلق روایت پر بھی انھوں نے اسی نوعیت کے سوالات اٹھائے اور آخر میں اپنا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"باوجود اس کے کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پورا قرآن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھا ہوا موجود تھا، سورۂ احزاب کی آخری آیتوں کا محض خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملنا ایسی باتیں ہیں جو یا تو بالکل بے اصل ہیں یا درمیان کے کسی راوی کے بیان کی وہ غلطی ہے جو اقتضاء بشریت سے بعید نہیں ہے۔ بہر حال یہ تمام روایات بمقابلہ اس تواتر اور توارث کے جس سے قرآن ہمیں ملا ہے، لائق اعتبار نہیں۔"

(تاریخ القرآن ۱۴۳)

مذکورہ روایات پر اسی نوعیت کی تنقید علامہ تمنا عمادی اور مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی نے بھی کی ہے، البتہ یہ حضرات اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں قرآن کا ایک باقاعدہ مرتب نسخہ بھی تیار کیا گیا تھا جس کے ہوتے ہوئے قرآن کی جمع و تدوین کی کسی نئی کوشش کی ضرورت ہی نہیں تھی۔[۲]

۲۔ تمنا عمادی، جمع القرآن، الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ کراچی، اکتوبر ۱۹۹۴ء۔ عنایت اللہ اسد سبحانی، بہجۃ الجنان فی تاریخ تدوین القرآن، موسسۃ نظام القرآن، ہندوستان، ۲۰۱۴ء۔

مصنف کا نقطۂ نظر اسی آخری رجحان کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور وہ ان روایات میں متن کی تعیین اور تحقیق کے حوالے سے ظاہراً سامنے آنے والی صورت واقعہ کو قرآن مجید کی تصریح کے منافی تصور کرتے ہیں۔ مصنف نے ان روایات پر کوئی تفصیلی کلام نہیں کیا، بلکہ اصولی تنقید کرنے پر اکتفا کی ہے۔ ان میں سے صحاح کی روایات میں، جو سنداً سب سے زیادہ قابل اعتماد ہو سکتی ہیں، مصنف نے سند کے پہلو سے اس کم زوری کی نشان دہی کی ہے کہ وہ اصلاً ابن شہاب زہری سے مروی ہیں، جن پر تدلیس اور ادراج کا بھی الزام ہے اور امام لیث بن سعد نے ان کے اقوال و آرا کے باہم متضاد ہونے کی بھی نشان دہی کی ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر سے ان پہلوؤں کی موجودگی میں ''اِن کی کوئی روایت بھی اِس طرح کے اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔'' اس خاص نکتے میں بھی مصنف کی رائے مفتی عبد اللطیف رحمانی اور علامہ تمنا عمادی کی تائید و موافقت پر مبنی ہے۔[۳]

[باقی]

۳۔ اس موضوع سے متعلق سند اور متن کے اعتبار سے صحاح اور دیگر کتب حدیث میں مروی روایات کے تفصیلی ناقدانہ جائزے کے لیے ڈاکٹر شہزاد سلیم کی کتاب ''History of the Qur’an'' ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

محمد وسیم اختر مفتی

قبیلہ بنو عبدالدار کے مومن اور مشرک

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچویں جد قُصی بن کلاب (۴۰۰ءتا۴۸۰ء) نے بنو خزاعہ کو مکہ سے بے دخل کر کے کعبہ کی تولیت قریش میں منتقل کی۔ ان کی وفات کے بعد بیت اللہ کے مناصب ان کے بیٹوں عبدالدار اور عبد مناف میں منقسم ہو گئے۔ کعبہ کی کلید برداری (حجابہ)، قریش کی اسمبلی (ندوہ) کے اہتمام اور جنگ میں علم برداری (لواء) کے فرائض بنو عبدالدار کو ملے، جب کہ حاجیوں کو پانی پلانے اور ان کی ضیافت و میز بانی (سقایہ اور رفادہ) کی ذمہ داری بنو عبد مناف کو حاصل ہو گئی۔

قصی کے دو اور بیٹے عبد العزیٰ اور عبد قصی تھے۔

عبدالدار کے تین بیٹے عثمان، عبد مناف اور سباق ہوئے۔

عثمان بن عبدالدار کی اولاد: عبدالعزیٰ، شریح۔ شریح بن عثمان جنگ احد میں مشرکین مکہ کی فوج میں شامل ہوا اور واصل جہنم ہوا۔

عبدالعزیٰ بن عثمان کے بیٹے: ابو طلحہ عبد اللہ، ابو ارطاۃ شرحبیل۔

ابو طلحہ عبد اللہ بن عبدالعزیٰ کی اولاد: طلحہ بن ابو طلحہ، عثمان بن ابو طلحہ، اسید بن ابو طلحہ۔ تینوں بھائیوں نے جنگ احد میں مشرکوں کے لشکر میں شامل ہو کر باری باری پرچم برداری کی۔ طلحہ بن ابو طلحہ حضرت علی کے ہاتھوں، عثمان بن ابو طلحہ اور اسید بن ابو طلحہ حضرت حمزہ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے۔

جنگ احد میں حضرت علی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچنے والے کٹر مشرک طلحہ بن ابو طلحہ کے چھ بیٹے تھے۔ حضرت عثمان بن طلحہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے اور عہد صدیقی میں ہونے والی جنگ اجنادین میں شہادت حاصل کی۔ حضرت شیبہ بن عثمان بن طلحہ نے حالت کفر میں معاذاللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے جنگ حنین میں شرکت کی، اللہ کی طرف سے اطلاع ہونے پر آپ نے اسے ڈانٹا تو خوف زدہ ہو گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ طلحہ بن ابو طلحہ کے باقی چاروں بیٹے مسافع، جلاس، کلاب اور حارث جنگ احد میں کفار کی طرف سے لڑتے ہوئے، کفار کا پرچم اٹھائے دنیا سے سدھارے۔

عبدالدار کے دوسرے بیٹے عبد مناف کے پوتے عکرمہ بن ہاشم نے بنو ہاشم کے بائیکاٹ کی دستاویز تحریر کی، جس کے نتیجے میں انھیں شعب ابو طالب بھیج دیا گیا۔ بعد میں اللہ کی طرف سے اس کا ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ عکرمہ بن ہاشم کا بھائی عبد شرحبیل جنگ بدر میں کفار مکہ کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اسی عبد مناف بن عبدالدار کے پڑپوتے حضرت مصعب بن عمیر بن ہاشم جلیل القدر صحابی ہوئے۔ اپنے خاندان کی روایت برقرار رکھتے ہوئے، علم اٹھائے جنگ احد میں شہید ہوئے۔ حبشہ کو ہجرت کرنے والے حضرت ابوالروم بن عمیر حضرت مصعب کے سوتیلے بھائی تھے۔ مہاجر حبشہ حضرت جہم بن قیس عبد مناف بن عبدالدار کے سکڑ پوتے تھے۔ عبد مناف بن عبدالدار حضرت فراس بن نضر کے پانچویں جد تھے۔

عبدالدار کے تیسرے بیٹے سباق کے تین بیویوں سے پانچ بیٹے ہوئے: حارث، عوف، عمیلہ، عبید، عبیداللہ۔ حضرت سویبط بن سعد کے دادا حرملہ بن مالک عمیلہ بن سباق کے پوتے تھے۔

جنگ بدر

غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا مشرکین کے تینوں جھنڈے حجابہ ولواء کے ذمہ دار قبیلے بنو عبدالدار کے افراد ابو عزیز بن عمیر، طلحہ بن ابو طلحہ اور نضر بن حارث نے اٹھائے ہوئے ہیں تو فرمایا: ہم عبدالدار سے وفا کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ جیش اسلامی کا سفید علم عبدالدار کے سکڑ پوتے حضرت مصعب بن عمیر کو عطا کیا۔ آپ نے مہاجرین کا سیاہ پرچم حضرت علی کو دیا اور انصار کا سیاہ علم حضرت سعد بن معاذ (یا عبادہ) کے ہاتھ میں تھمایا۔

حرم کعبہ کی کلید برداری

بیت اللہ کا کلید بردار ہونا غیر معمولی عزت کی بات ہے۔ اسلام کے خلاف بنو عبدالدار کے جرائم بہت زیادہ

تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں کلید برداری سے محروم کر دیں گے۔ اسی لیے حضرت عباس اور حضرت علی نے اس منصب کے حصول کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی آیت 'اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا'، ''اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کے سپرد کر دو'' (النساء ۴: ۵۸) کے تحت دوسرا فیصلہ کیا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز بلند ہوئی: عثمان بن ابوطلحہ کہاں ہیں؟ وہ حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: عثمان، آج نیکی اور ایفاے عہد کا دن ہے۔ یہ چابی سنبھال لو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ کوئی ظالم ہی اسے تمھارے خاندان سے چھیننے کی جرأت کرے گا۔ چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ بیت اللہ کی چابی آج بھی حضرت عثمان بن طلحہ کی اولاد، خاندان شعیبی کے پاس ہے، کسی کو یہ اعزاز چھیننے کی جرأت نہیں ہوئی۔

مطالعۂ مزید: جمل من انساب الاشراف (بلاذری)، نسب قریش (مصعب زبیری)، ویکیپیڈیا، Wikipedia۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

بچوں سے قرآن حفظ کرانا

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

عہد رسالت سے قرآن مجید حفظ و تحریر، دونوں طریقوں سے محفوظ کر کے آیندہ نسلوں کو منتقل کیا گیا۔ صحابہ اور تابعین اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق قرآن مجید مکمل یا جزواًیاد کر لیتے تھے، لیکن رسمی حفظ قرآن اور بچوں کو بالجبر قرآن یاد کرانے کا کوئی تصور نہ تھا۔

مسلمانوں کو ایک طویل عرصے سے یہ باور کرادیا گیا ہے کہ حفظ قران کے لیے بہترین عمر بچپن کی ہے۔بتایا جاتا ہے کہ ایک حافظ قرآن اپنے خاندان کے دس ایسے افراد کو جنت میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی،[1] حافظ قرآن کے والدین کو روز قیامت ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی روشنی

۱۔ 'لِحَامِلِ الْقُرْآنِ إِذَا أَحَلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ أَنْ يَشْفَعَ فِي عَشْرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ'، ''وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیا کو حلال اور حرام کردہ اشیا کو حرام کرتا ہے، وہ اپنے گھرانے کے دس افراد، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی، سفارش کرے گا''(المعجم الاوسط، رقم ۵۲۵۸)۔

اسے علامہ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے(ضعیف الجامع الصغیر وزیادتہ، رقم ۴۶۶۲)۔

اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی ضعیف ہے:

'مَن قرأَ القرآنَ واستَظهرَهُ فأحلَّ حلالَهُ وحرَّمَ حرامَهُ أدخلَهُ اللهُ بِهِ الجنَّةَ وشفَّعَهُ في عَشرةٍ من أهلِ بَيتِهِ كلُّهُم قد وجبَت لَهُ النّارُ'، ''جس نے قرآن پڑھا، اسے حفظ کیا، اس کی حلال کردہ اشیا کو حلال اور حرام کردہ اشیا

سے بھی زیادہ ہوگی۔[۲] ان ترغیبات کے زیر اثر والدین یہ سعادت حاصل کرنے اور جہنم سے بچنے کے لیے ہر قیمت پر اپنے بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ گلی، محلوں، گاؤں اور شہروں میں جگہ جگہ کھلے ہوئے حفظ قرآن کے مدارس ایسے ہی بچوں سے آباد اور ایک بڑے طبقے کے معاش کا ذریعہ ہیں۔

حفظ قرآن کی فضیلت سے متعلق محولہ بالا روایات ضعیف ہیں۔ یہ دین کے مسلمہ اصولوں کے بھی خلاف ہیں۔ قرآن مجید ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھیراتا ہے،[۳] وہ بتاتا ہے کہ خدا کی عدالت میں کوئی کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا، وہاں سفارش کی اجازت ایسے کچھ لوگوں کے لیے ملے گی جن کے لیے جہنم کا فیصلہ نہیں ہوا ہوگا، مگر ان کے اچھے اعمال بھی اس قابل نہ ہوں گے کہ انھیں جنت کے لائق بنا دیں۔ البتہ، وہ لوگ جن کے لیے جہنم کا فیصلہ ہو جائے گا، انھیں کسی کی سفارش کام نہ آئے گی۔[۴]

کو حرام کرتا ہے، وہ اپنے گھرانے کے دس افراد، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی، سفارش کرے گا‘‘(ترمذی، رقم ۲۹۰۵)۔

امام ترمذی اس کی سند کو صحیح نہیں بتاتے۔ علامہ البانی نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے (ضعیف الترمذی، رقم ۲۹۰۵)۔

۲۔ ’حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ السَّرْحِ، أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، عَنْ زَبَّانِ بْنِ فَائِدٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ الْجُهَنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهَذَا؟»‘، ’’معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہوگی جو تمھارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمھارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہوگا‘‘‘‘۔

علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (مشکاۃ المصابیح، رقم ۲۱۳۹)۔

۳۔ المدثر ۷۴: ۳۸۔ ’كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ‘، ’’ہر متنفس (اُس روز) اپنی کمائی کے بدلے رہن ہوگا۔‘‘

۴۔ البقرہ ۲: ۴۸۔ ’وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ‘، ’’اور اُس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اُس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔‘‘

مگر والدین ان بر سر خود غلط ترغیبات سے متاثر ہو کر اپنے کم سن بچوں کو زبردستی حفظ کرانے کے لیے کسی مدرسے میں چھوڑ جاتے ہیں، بلکہ ترجیحاً اپنے گاؤں، محلے اور گھر سے دور کسی مدرسے میں انھیں داخل کراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے علاقے اور گھر کے قریب کے مدرسے میں بچے کی توجہ اپنے خاندان اور دوستوں سے ملنے کی تڑپ میں منتشر رہتی ہے، چنانچہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسے ان سب سے دور بھیج دیا جائے، جہاں وہ کوئی شناسا نہ پائے اور پوری توجہ سے قرآن مجید حفظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔

مدارس میں بچوں کے داخلے کی ایک اور وجہ غربت بھی ہے۔ بچوں کو پیش آنے والے تمام ممکنہ حادثات کے خدشات کے باوجود والدین انھیں مدارس میں اس لیے بھی داخل کرا دیتے ہیں کہ مدرسے کے خرچ پر پل کر وہ بڑے ہو جائیں اور اس دوران میں کچھ تعلیم بھی حاصل کر لیں، جو بعد میں ان کے کام بھی آسکتی ہے۔

راقم کو ایسے والدین دیکھنے کا موقع ملا جن کے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی۔ انھیں خبر کی گئی، وہ آئے مگر بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے اسے تسلی دے کر پھر اسی مدرسے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت ہوا تو ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں اسے داخل کرا دیا، مگر حفظ قرآن مکمل کرائے بغیر وہ اسے واپس لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے لیے ایسے حادثات غیر متوقع نہیں تھے۔ ان خدشات کو گوارا کرتے ہوئے ہی وہ اپنے کم سن بچوں کو اجنبی ماحول کے سپرد کر آتے ہیں۔

والدین کی شفقت اور احساس تحفظ سے محروم ہو جانے کے بعد ایک اجنبی ماحول میں بچہ جس جذباتی المیے سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بچپن کی بے فکری کا یہ خوب صورت دور ایک سخت روٹین کے شکنجے میں پھنس جاتا ہے۔ ایک محدود ماحول میں مقید ہو جانے سے معاشرتی رویے سیکھنے کے مواقع بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ مختلف عمر اور مزاج کے لڑکوں اور اساتذہ کے درمیان اس کی معصومیت بھی ہمہ وقت خطرے میں رہتی ہے۔ بچہ جتنا کم عمر، خوش شکل اور والدین کی خبر گیری سے دور ہوتا ہے، اس کے استحصال کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔

بچے سے قرآن حفظ کرانے کے لیے والدین نہ صرف خود اس پر تشدد کرتے ہیں، بلکہ اساتذہ کو بھی اس کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بے اصل روایت بھی مشہور کر رکھی ہے کہ جسم کے جس حصے پر استاد کی مار پڑتی ہے، اس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ تشدد کی صورت میں بچہ اگر زخمی ہو جائے یا، خدانہ خواستہ، اس کی موت واقع ہو جائے تو والدین عموماً استاد کو معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق بچہ خدا کی راہ میں شہید ہو گیا۔ یوں والدین کی آخرت سنور گئی۔ یہی ان کا نصب العین تھا، جو قبل از وقت

حاصل ہو گیا۔ اس 'خدمت' کے عوض استاد کو سزا کیوں دی جائے؟ سزا سے مامونیت کی یہ توقع تشدد پسند طبائع کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

کچھ بچوں میں اتنی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ پورا قرآن یاد کر سکیں۔ راقم کے تجربے میں ایسے والدین بھی آئے جنھیں بتایا گیا کہ ان کا بچہ حفظ نہیں کر سکتا، لہٰذا اسے مجبور نہ کریں۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بضد رہے کہ بچے کو ہر صورت حفظ کرایا جائے۔ ان کے مطابق حفظ کرنے کی محنت سے دماغ تیز ہو جاتا ہے۔

ایسے بچوں کو برسوں حفظ کی چکی میں پیسا جاتا ہے۔ سبق یاد نہ کر سکنے کی پاداش میں سب کے سامنے مار پیٹ اور ذلت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انھیں باور کرایا جاتا ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، اس وجہ سے ان کی یادداشت کام نہیں کر رہی، اور یہ کہ حافظ قرآن کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ شیطان لگے ہوتے ہیں، جو اسے حفظ قرآن کی سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورت حال کسی اذیت گاہ (ٹارچر سیل) سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ ہر صبح یہ سوچ کر اٹھتا ہے کہ تشدد اور ذلت کا ایک اور طویل دن اس کا منتظر ہے۔ وہ خود کو گناہ گار سمجھتا ہے، جس سے اس کے والدین راضی ہیں نہ اساتذہ اور نہ ہی خدا۔ ہم مکتب ساتھیوں کی نظروں میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ایسے بچے مدرسے اور گھر سے بھاگ جاتے ہیں تو پکڑ پکڑ کر لائے جاتے ہیں اور بھاگنے پر مزید تشدد اور ذلت سہتے ہیں۔ ان کی عزت نفس ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ مکمل طور پر منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں، جو ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر لیتی ہے اور پھر مختلف منفی رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بہت سے طلبہ میں انھی وجوہات سے قرآن مجید سے بدمزگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

علم نفسیات کے مطابق، خدا کا پہلا تصور والدین سے ملے تاثرات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں اساتذہ کی شخصیت کے تاثرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کی شفقت سے محروم اور اساتذہ کی سختیوں سے گھائل ان بچوں میں خدا سے بھی بے زاری، لاتعلقی، بلکہ توحش کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لینے کے بعد وہ خدا کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ والدین سے ناراض ہوتے ہیں، مگر ان کی ناراضی سے ڈرتے بھی ہیں۔ یہی نفسیات خدا کے ساتھ ان کے تعلق میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ خدا سے محبت نہیں کر پاتے،

لیکن اس کے ڈر کے احساس سے اس کی رسمی اور قانونی قسم کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کی یہی نفسیات لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عام طور پر خوف دلاتے اور جبر اور دھونس سے بات منواتے نظر آتے ہیں۔

بچہ ہو یا بڑا اس کی مرضی کے بغیر اسے کسی ایسی ذہنی یا جسمانی مشقت میں مبتلا کرنا، جس کا مطالبہ دین اور عقل نہیں کرتے، اس کا استحصال ہے۔ حفظ قرآن ان بنیادی مہارتوں کی تعلیم نہیں ہے جن کا سیکھنا ناگزیر ہوتا ہے اور اس بنا پر انھیں بچپن میں زبردستی بھی سکھایا جاتا ہے، جیسے لکھنا پڑھنا، ابتدائی ریاضی وغیرہ۔ حفظ قرآن ایک تخصیصی تعلیم ہے اور تخصیصی تعلیم بچے کا رجحان جانچے بغیر نہیں دی جا سکتی۔ جس طرح کسی بچے کے کیریئر کے لیے میڈیکل یا انجینئرنگ کی تعلیم کے حصول کا فیصلہ اس کے بچپن میں نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اسے حفظ کرانے کا فیصلہ بھی اس کے بچپن میں نہیں کیا جا سکتا۔

دس سے بارہ سال کی وسیع البنیاد تعلیم پانا تعلیمی رجحان رکھنے والے ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ اس کے بعد اس کا خصوصی رجحان دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اسے کس طرح کی تخصیصی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ حفظ قرآن کی تخصیصی تعلیم حاصل کرنا ایک فرد کے اپنے ذوق، صلاحیت اور شعوری انتخاب کا معاملہ ہے، جو شعور کی عمر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

والدین کو بھی بچوں کے کیریئر کے انتخاب کا کوئی مطلق اختیار نہیں ہے۔ یہاں مریم علیہا السلام کے واقعہ سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی والدہ نے ان کی پیدایش سے پہلے ہی انھیں خدا کے نام پر وقف کر دیا تھا، اس لیے والدین کو بچوں کے کیریئر کے انتخاب کا حق ہے۔ یہ، درحقیقت، مریم علیہا السلام کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کو دین کی خدمت کے لیے خدا کے نام پر وقف کر دیں۔ قرآن مجید میں ان کی دعا ان کی اسی خواہش کا اظہار ہے۔[۵] مگر مریم علیہا السلام پر اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایسے ہی جیسے بچپن میں طے کیے گئے نکاح کو برقرار رکھنے کی پابندی بچوں پر نہیں ہوتی۔ وہ شعور اور بلوغت

۵۔ آل عمران ۳: ۳۵۔ 'اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ج اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'، ''اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اُس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے۔ سو تو میری طرف سے اِس کو قبول فرما، بے شک تو ہی سمیع و علیم ہے۔''

کی عمر کو پہنچ کر ایسے نکاح سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مریم علیہا السلام کی اپنی طبیعت بھی اسی کام کی طرف مائل رہی جس کی خواہش اور دعا ان کی والدہ نے کی تھی۔ پھر یوں نہیں ہوا کہ مریم علیہا السلام کے پیدا ہوتے ہی یا ان کی کم سنی میں انھیں دین کے خدام کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں۔ تاہم، یہ اقدام ان کی شعور کی عمر کے بعد ہی کیا گیا ہو گا۔ اصولی طور پر اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے اس پر من وعن عمل کرنے سے پہلے اپنے بیٹے کی رائے لی، اور بیٹے کی رضامندی کے بعد ہی اقدام کیا۔

دینی مدارس میں رائج حفظ قرآن کی کلاس کا طویل دورانیہ جو صبح فجر کے بعد سے نماز عشا تک، چند وقفوں کے ساتھ جاری رہتا ہے، بچوں پر سخت گراں بار ہوتا ہے۔ اس سرگرمی میں کوئی تنوع بھی نہیں ہوتا کہ بچہ یکسانیت کی بوریت سے نجات پا سکے۔ زبانی یاد کرنے کی ایک ہی سرگرمی اتنے طویل دورانیے تک کرانا، ایک غیر صحت مند طریقۂ تعلیم ہے۔

کچھ بچوں کو اسکول سے ہٹا کر حفظ کرانے بٹھا دیا جاتا ہے۔ حفظ کے بعد انھیں دوبارہ اسکول میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ اسکول کی تعلیم کا حرج کم کرنے اور قرآن کا حفظ جلد مکمل کرانے کی خاطر بچے کا زیادہ سے زیادہ وقت حفظ قرآن میں لگایا جاتا ہے۔ کھیلنے اور دوستوں اور کزنز کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع انھیں بہت کم ملتا ہے۔ اس سے بچے کا ذہنی اور جسمانی استحصال ہوتا ہے۔

اس سے بدتر پریکٹس یہ ہے کہ اسکول کے ساتھ حفظ بھی کرایا جاتا ہے۔ یوں بچے والدین کی دو طرفہ خواہشوں کے پاٹوں میں پس کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں اپنا بچپن جینے کا پورا موقع ہی نہیں ملتا۔

کم سن بچوں کا زیادہ وقت کھیل کود میں بیتنا چاہیے۔ ایسی ہر تعلیمی سرگرمی جس کے اوقات کھیل کے اوقات سے زیادہ ہوں، بچوں کا استحصال ہے۔ بچپن کی عمر کھیل کھیل میں سیکھنے، خود کھوجنے اور سوالات کرنے کی ہے۔ لاپروائی کی اس حسین عمر کو ایک سخت اور خشک روٹین کی نذر کرنا بچے کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

ایک بار یاد کر لینے کے بعد قرآن مجید کو مستقلاً یاد رکھنا ایک مسلسل محنت طلب کام ہے۔ شعبۂ حفظ سے منسلک حفاظ کسی حد تک قرآن یاد رکھ پاتے ہیں، مگر عام حفاظ جو عملی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں، ان کے لیے قرآن مجید کو یاد رکھنا بے حد مشکل رہتا ہے۔ ان کی اکثریت کو بڑی عمر میں پورا قرآن یاد نہیں رہتا۔ ان

کا حفظ قرآن خود ایک یادگار بن کر رہ جاتا ہے۔

ادھر قرآن مجید کے بھلا دینے پر بعض روایات میں وارد ہونے والی وعیدیں قرآن یاد نہ رکھ سکنے والے حفاظ کو احساس جرم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ تاہم، یہ تمام روایات ضعیف ہیں۔[6]

۶۔ مثلاً درج ذیل روایت دیکھیے:

'وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوبُ أُمَّتِي فَلَمْ أَرَ ذَنْبًا أَعْظَمَ مِنْ سُورَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ أَوْ آيَةٍ أُوتِيهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُد'، ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میری امت کے اعمال کا ثواب مجھ پر پیش کیا گیا، حتیٰ کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے (اس کا ثواب بھی لکھا ہوا تھا)، اور میری امت کے گناہ بھی مجھ پر پیش کیے گئے تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت عطا کی گئی اور اس نے (یاد کرنے کے بعد) اسے بھلا دیا'' (مشکاۃ المصابیح، رقم ۷۲۰)۔

حافظ زبیر علی زئی نے اس کی اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے:

رواہ الترمذی (۲۹۱۶ وقال: غريب) وابو داؤد (۴۶۱)۔ ابن جریج مدلس ولم يسمع من مطلب شيئًا والمطلب: لم يسمع من سيدنا أنس رضي الله عنه.

https://islamicurdubooks.com/ur/hadith/hadith-.php?bookid=23&hadith_number=720

اس مفہوم کی درج ذیل روایت بھی ضعیف ہے:

'وعن سعد بن عبادة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ما من امرئ يقرا القرآن ثم ينساه إلا لقي الله يوم القيامة اجذم»'، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص قرآن پڑھتا ہو، لیکن پھر وہ اسے بھول جائے تو وہ روز قیامت حالت کوڑھ میں اللہ سے ملاقات کرے گا'' (رواہ ابو داؤد والدارمی)۔

حافظ زبیر علی زئی نے اس کی اسناد کو بھی ضعیف قرار دیا ہے:

يزيد بن أبي زياد: ضعيف و عيسي بن فائد: مجهول، ولم يسمعه من سعد، بينهما رجل مجهول.

https://www.islamicurdubooks.com/hadith/hadith-.php?hadith_number=2200&bookid=23&tarqeem=1

مشفق سلطان

ہندو مت اور تصور نبوت؟

(۲)

گذشتہ سے پیوستہ

پچھلے حصے میں ہم نے دیکھ لیا تھا کہ اہل ہند خدا تعالیٰ کے ایک رسول سیدنا نوح علیہ السلام (منو) سے واقف ہیں اور خود کو ان کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ مہابھارت کی روایت کے مطابق جس مچھلی نے منو ویوسوت اور ان کے ہم راہ سات رشیوں کو طوفان سے بچایا، اس نے بالآخر خود کو برہما (ذات باری) کا جسدی ظہور قرار دیا۔ اسی طرح کے بیانات سے ہندو مذہب میں 'اوتار' (Avatara) کا تصور پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ 'اوتار' کا تصور بتدریج ارتقا پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس کا مختصر جائزہ تو ہم لیں گے، تاہم ہماری زیادہ دل چسپی تصور اوتار کے عملی پہلو (functional aspect) کے تجزیہ میں ہے۔ اس حصہ میں ہندو دھرم کی معتبر کتابوں کی عبارات نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ہم قرآن مجید کی آیات اور احادیث پیش کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔

لفظ 'اوتار' کی تحقیق

پہلے اس لفظ کو دیکھتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم میں ہے:

"The word 'avatāra' comes from the Sanskrit ava + √tṛ, 'to descend, or cross downwards', and is best translated as 'descent' rather than 'incarnation', which inevitably invites unhelpful comparisons with a doctrine specific to Christianity.[۹]"

۹- John Cush, Catherine Robinson, and Michael York, *Encyclopedia of Hinduism*

”لفظ ’اوتار‘ سنسکرت کے ’او‘ کے ساتھ ’تِرِ‘ مصدر جوڑنے سے بنا ہے، جس کا مطلب ’نیچے اترنا یا نیچے کی طرف پھلانگنا‘ ہے، اور ’تجسیم‘ کے بجاے اس کا مناسب ترین ترجمہ ’نزول‘ ہے، کیونکہ ’تجسیم‘ کا لفظ مسیحیت کے مخصوص عقیدے کے ساتھ غیر ضروری موازنہ کو جنم دیتا ہے۔“

زبان کے پہلو سے یہ بات ملحوظ رہے کہ اردو کے الفاظ ’اُتار‘، ’اُتر‘ اور ’اُترنا‘ بھی سنسکرت کے اسی مصدر سے ماخوذ ہیں، جس سے لفظ ’اوتار‘ نکلا ہے[۱۰]۔

’اوتار‘ کا لفظ ویدوں کے متن میں من وعن موجود نہیں ہے، تاہم اس سے ملتے جلتے الفاظ بعض مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن کیا اوتار کا مروجہ تصور ویدوں میں پایا جاتا ہے؟ یہ محل نظر ہے۔ یہ بحث اوتار کی تفہیم پر منحصر ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک ذات باری کے زمین پر مادی صورت میں آنے کو اوتار کہتے ہیں، وہ ویدوں میں مذکور دیوتاؤں، بالخصوص ایک غیر معمولی دیوتا ’اِندر‘ (Indra) کے مختلف صورتیں اختیار کرنے کے واقعات سے دلیل پکڑتے ہیں[۱۱]۔

لفظ ’اوتار‘ میں ’اترنے‘، ’نازل ہونے‘ یا ’نیچے آنے‘ کا پہلو اہم ہے اور اس پر ہم آگے چل کر قرآن مجید کی روشنی میں مزید غور کریں گے۔

اوتار کا بنیادی تصور

اوتار کی ضرورت اور مقاصد کا سب سے واضح بیان بھگود گیتا کے چوتھے باب میں ہوا ہے۔

دھرم کی تاریخ

چوتھے باب کے آغاز میں دھرم کی روایت کا تذکرہ کچھ اس طرح سے ہوا ہے:

श्रीभगवानुवाच

इमं विवस्वते योगं प्रोक्तवानहमव्ययम् ।

विवस्वान्मनवे प्राह मनुरिक्ष्वाकवेऽब्रवीत् ॥ १ ॥

(London: Routledge, 2008), 65.

۱۰۔ دیکھیے فرہنگ آصفیہ، نور اللغات وغیرہ۔

۱۱۔ دیکھیے رِگوید مَنڈل ۳، سُوکت ۵۳، منتر ۸؛ منڈل ۶، سوکت ۴۷، منتر ۱۸؛ منڈل ۱، سوکت ۵۱، منتر ۱۳، وغیرہ۔

एवं परम्पराप्राप्तमिमं राजर्षयो विदुः ।

स कालेनेह महता योगे नष्टः परन्तप ॥ २ ॥

स एवायं मया तेऽद्य योगः प्रोक्तः पुरातनः ।

भक्तोऽसि मे सखा चेति रहस्यं ह्येतदुत्तमम् ॥ ३ ॥[۱۲]

”شری بھگوان نے کہا: یہ لافانی فلسفہ میں نے ووسوان کو سکھایا۔ انھوں نے منو کو اور منو نے اکشواکو کو سکھایا۔ اے دشمنوں کو خوف زدہ کرنے والے! سلسلہ راج رشیوں نے اس فلسفہ کو جانا۔ لیکن امتداد زمانہ کے باعث یہ فلسفہ دنیا سے غائب ہو گیا۔ اب اسی پرانے فلسفہ کو آج میں نے تجھے بتایا، کیوں کہ تو میرا شاگرد اور دوست ہے اور یہ اعلیٰ ترین راز کی چیز ہے۔“ (ادھیائے ۴، اشلوک ۱-۳)

مذکورہ بالا عبارت میں دھرم کی تاریخ کا بیان ہے۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ دھرم کی جو تعلیم ارجن کو شری کرشن کے ذریعے سے از سر نو دی جا رہی ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ وہی تعلیم ہے جو اس سے پہلے بھی موجود رہی ہے۔

۲۔ یہ تعلیم ایک زندہ روایت کی صورت میں ایک عرصہ تک چلتی رہی اور لوگ اس سے مانوس تھے۔

۳۔ منو کو بھی یہی تعلیم دی گئی تھی اور انھوں نے آگے بھی یہی تعلیم منتقل کی تھی۔

۴۔ امتداد زمانہ کے باعث یہ تعلیم دنیا سے غائب ہو گئی۔

قرآن کی روشنی

بھگود گیتا کے اس اقتباس کے ساتھ قرآن مجید کی درج ذیل آیات دیکھی جاسکتی ہیں:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ

”لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار

۱۲۔ śrī-bhagavān uvāca. imaṁ vivasvate yogaṁ proktavān aham avyayam. vivasvān manave prāha manur ikṣvākave ’bravīt. evaṁ paramparā-prāptam imaṁ rājarṣayo viduḥ. sa kāleneha mahatā yogo naṣṭaḥ paran-tapa. sa evāyaṁ mayā te ’dya yogaḥ proktaḥ purātanaḥ. bhakto ’si me sakhā ceti rahasyaṁ hy etad uttamam.

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔ یہ جن کو دی گئی، اِس میں اختلاف بھی اُنھی لوگوں نے کیا، نہایت واضح دلائل کے اُن کے سامنے آجانے کے بعد، محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے۔ پھر یہ جو (قرآن کے) ماننے والے ہیں، اللہ نے اپنی توفیق سے اُس حق کے بارے میں اِن کی رہنمائی کی جس میں یہ اختلاف کر رہے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔"

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ. (یونس ۱۰: ۱۹)

"حقیقت یہ ہے کہ لوگ ایک ہی امت تھے، انھوں نے بعد میں اختلاف کیا ہے اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ کر لی گئی ہوتی تو اِن کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دیا جاتا جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔"

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. (الشوریٰ ۴۲: ۱۳)

"اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔"

قرآن مجید کی درج بالا آیات سے جو باتیں سمجھ میں آتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ دین کی جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دی جا رہی ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ وہی

تعلیم ہے جو ان سے پہلے کے انبیا و رسل کو دی جاتی رہی ہے۔

۲۔ خدا نے انسانیت کی ابتدا ایک ہی دین سے کی تھی۔ اُس وقت تمام انسان توحید کے ماننے والے تھے۔ دین کے بارے میں اختلافات موجود نہیں تھے۔

۳۔ پھر اختلافات پیدا ہو گئے اور اس درجے میں پیدا ہو گئے کہ دین کی حقیقت محجوب ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کا سلسلہ شروع کیا۔

۴۔ انبیا کی بعثت کے بعد بھی جن امتوں کو یہ حق عطا ہوا، انھوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے بعد محض آپس کی ضدم ضدا کے سبب سے خود ہی اس میں اختلاف کیا۔ انھی لوگوں نے کیا جو اس حق کے امین بنائے گئے تھے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ پھر اس قرآن کے ذریعے سے اہل ایمان، یعنی پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں پر کھولی ہے۔

اوتار کی ضرورت

اوتار کی ضرورت اور مقاصد کا بیان بھگود گیتا کے اسی باب میں اس طرح ہوا ہے:

यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानिर्भवति भारत ।
अभ्युत्थानमधर्मस्य तदात्मानं सृजाम्यहम् ॥ ७ ॥
परित्राणाय साधुनां विनाशाय च दुष्कृताम् ।
धर्मसंस्थापनार्थाय सम्भवामि युगे युगे ॥ ८ ॥[۱۳]

”اے بھارت! جب کبھی حق (دھرم) کو زوال آتا ہے اور باطل (ادھرم) کو فروغ ہوتا ہے تو میں نمایاں ہو جاتا ہوں۔ راست باز کی حفاظت، کج رو کی تباہی اور حق (دھرم) کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لیے میں مختلف زمانوں میں آیا گیا ہوں۔“[۱۴] (ادھیائے ۴، اشلوک ۷-۸)

۱۳- yadā yadā hi dharmasya glānir bhavati bhārata. abhyutthānam adharmasya tadātmānaṁ sṛjāmy aham. paritrāṇāya sādhūnāṁ vināśāya ca duṣkṛtām. Dharma-saṁsthāpanārthāya sambhavāmi yuge yuge.

۱۴- اردو ترجمہ از حسن الدین احمد؛ ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۹۷ء، نئی دہلی

اگرچہ یہاں 'اوتار' کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، تاہم اہل علم اس کو اوتار ہی کا بیان مانتے ہیں۔ ان اشلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اوتار اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب دھرم زوال پذیر ہوتا اور معاشرے میں ادھرم کا غلبہ واقع ہوتا ہے۔

اس عبارت میں بعض اہم الفاظ اور تراکیب کو دیکھیے:

''तदात्मानं सृजाम्यहम'' کا لفظی ترجمہ ہوتا ہے: ''اس وقت میں خود تخلیق ہوتا ہوں''۔ چونکہ ذات باری کے لیے یہ امر محال ہے، اس لیے یہاں 'سرجامی' کا ترجمہ 'نمایاں ہونے' یا 'ظاہر ہونے' کے کرتے ہیں۔

لفظ ''सम्भव'' بھی دل چسپ ہے۔ اس کے معنی جس طرح 'پیدایش'، 'ابتدا' کے ہیں، اسی طرح 'واقع ہونا' اور 'ظاہر ہونا' کے بھی ہیں۔

لفظ '': ग्लानि'' یعنی زوال سے مراد دھرم کا سیاسی و سماجی زوال ہے یا پھر دھرم کی تعلیمات کا ضائع یا غیر واضح ہو جانا؟ ہماری راے میں یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، کیونکہ اس باب کے آغاز ہی میں امتداد زمانہ سے دھرم کی تعلیم کا دنیا سے غائب ہونے کا ذکر ہے۔

مذکورہ اشلوکوں میں اوتار کے بنیادی مقاصد کو تین اہم پہلوؤں سے سمجھایا گیا ہے:

۱۔ اوتار کا پہلا مقصد راست بازوں (سادھونام) کو نجات دینا ہے، یعنی وہ لوگ جو اپنی عقیدت اور راست بازی پر قائم رہتے ہیں، ان کی حفاظت اور مدد کرنا، جب کہ ادھرم بڑھتا جا رہا ہو۔

۲۔ اوتار کا دوسرا مقصد بدکرداروں (دُشکرتام) کا خاتمہ کرنا ہے، یعنی وہ افراد یا قوتیں جو ادھرم پھیلانے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔

۳۔ اوتار کا تیسرا اہم مقصد دھرم کو قائم کرنا (دھرم سنستھاپنا) ہے۔

[باقی]

سجاد بشیر

مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ: یونان یا قرآن

اس سے پہلے کہ ہم اس بحث کو شروع کریں کہ مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ کیا ہے؟ پہلے یہ بنیادی سوال اٹھانا بہت ضروری ہے کہ خود فلسفے سے کیا مراد ہے؟ کلاسیکی فلسفے کی تعریف حکمت کے معنوں میں مستعمل تھی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ فلسفہ دو یونانی لفظوں سے مرکب ہے۔

(φίλο)''فیلو''، جس کا مطلب ہے: ''محبت''

(σοφία)''سوفیا''، جس کا مطلب ہے: ''حکمت''

جس کے معنی محبت اور سوفی جس کے معنی حکمت کے ہیں، یعنی فلسفہ حکمت سے محبت کو کہتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن حکمت سے خالی ہے؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا، بلکہ قرآن خود حکمت کی ترویج کرتا ہے۔ کچھ آیات دیکھیے:

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (البقرہ ۲: ۲۶۹)

''اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جسے حکمت ملی، اسے بڑی بھلائی مل گئی۔ اور یہ وہی لوگ سمجھتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

یہ آیت حکمت کی عظمت کو واضح کرتی ہے کہ اللہ حکمت کو ایک خیر عظیم سمجھ کر اپنے منتخب بندوں کو عطا کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ

''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرو، اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ. (لقمان ۳۱: ۱۲)

کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔"

یہاں حضرت لقمان کو عطا کی گئی حکمت کا ذکر کیا گیا ہے اور اللہ کے شکر گزار ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا. (النساء ۴: ۱۱۳)

"اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور آپ کو وہ باتیں سکھائیں جو آپ نہیں جانتے تھے، اور اللہ کا آپ پر بڑا فضل ہے۔"

یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی حکمت اور علم کا ذکر کرتی ہے اور اس آیت میں بھی حکمت کو فضل قرار دیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. (الجمعہ ۶۲: ۲)

"وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ایک رسول بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتے ہیں، انھیں پاکیزہ کرتے ہیں اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گم راہی میں تھے۔"

یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو بیان کرتی ہے کہ آپ کو لوگوں کو کتاب (قرآن) اور حکمت سکھانے کے لیے بھیجا گیا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (البقرہ ۲: ۱۲۹)

"اے ہمارے رب! ان میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے، اور انھیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انھیں پاکیزہ کرے، بے شک تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔"

یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ اللہ ان کی اولاد میں ایک رسول بھیجے، جو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا.

"کیا یہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کیا؟ ہم نے آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور انھیں بڑی بادشاہی عطا

کی۔“ (النساء۴: ۵۴)

رہی یہ بات کہ قرآن کا اسلوب شاعرانہ یا خطیبانہ ہے تو ہمیں تاریخی اعتبار سے یہ معلوم ہے کہ قدیم یونانی فلسفی پارمنیڈیز، ایمپیڈ کلیز اور وزینوفینیز وغیرہ اپنے فلسفیانہ افکار شعری صورت میں بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ اس سطح پر قرآن کے طرز استدلال اور قدیم فلسفے کے طرز استدلال میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن کے ڈھانچے میں وہ ایک خاص منطقی ربط سے ہی قابل قبول بنتا ہے۔

غزالی نے قرآن پر منطقی کام کے کچھ نمونے یوں بھی پیش کیے ہیں:

“The first figure of the Aristotelian categorical syllogism comes from Qurʾan 2:258, where Abraham shows Nimrod that he is not a god by asking him to make the sun rise in the west. The usual form of such a proof is as follows:

- [Whoever has power over the sunrise is God.]
- My god is the one who has power over the sunrise.
- Therefore, my god is God.

In the second figure, one premise must be negative and the major premise must be universal. Ghazalı - uses another example from the life of Abraham, when he mistook the moon, sun, and stars for God until he saw them set.

- The moon sets.
- The Deity does not “set.”
- Therefore, the moon is not a deity.

As can be seen from this brief treatment, reasoning is an integral part of the Qurʾan and has shaped the thoughts of Quranic scholars.”

”ارسطو کے اقسام کے مقولی قیاس کی پہلی شکل (Categorical Syllogism) کی ایک مثال قرآن کی سورۂ بقرہ ۲: ۲۵۸ میں موجود ہے، جہاں حضرت ابراہیم نے نمرود کو یہ ثابت کیا کہ وہ خدا نہیں ہے، اس سوال کے ذریعے سے کہ نمرود سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھادے۔ ایسی دلیل کی عمومی شکل یوں بنتی ہے۔

- جس کے پاس سورج کے طلوع کرنے کی طاقت ہو، وہ خدا ہے۔
- میرے خدا کے پاس سورج کے طلوع کرنے کی طاقت ہے۔
- لہٰذا، میرا خدا ہی سچا خدا ہے۔

دوسری شکل میں، ایک مقدمہ لازمی طور پر منفی ہونا چاہیے اور مقدمۂ کبریٰ کُلی ہونا چاہیے۔ غزالی نے حضرت ابراہیم کی زندگی سے ایک اور مثال دی ہے کہ جب انھوں نے چاند، سورج اور ستاروں کو خدا سمجھا، یہاں تک کہ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ غروب ہو جاتے ہیں:

- چاند غروب ہوتا ہے۔
- معبود غروب نہیں ہوتا۔
- لہٰذا، چاند معبود نہیں ہے۔

جیسا کہ اس مختصر وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے، استدلال (Reasoning)۔ قرآن کا ایک لازمی حصہ ہے اور اس نے قرآنی علما کے افکار کو متاثر کیا ہے۔"[1]

ظاہر ہے کہ قرآن پر اب بھی اس طرح کا کام کر کے منطق و فلسفے کے ذریعے سے بہت کچھ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر استخراجی منطق سے استفادہ اٹھاتے ہوئے مقدمات کو منطقی شکل میں بھی ڈھالا جا سکتا ہے۔ خیر دوسرا سوال تو اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ مسلم فکر میں فلسفے کا ارتقا ایک تاریخی معاملہ ہے، خاص طور پر اوائل میں مسلمانوں کی سلطنت کی ترقی کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے اسے دوسری اقوام کے علوم و فنون سے استفادے پر مجبور کیا۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ قرآن کی نوعیت تو فلسفیانہ نہیں ہے، تاہم جو مضامین اس میں زیر بحث آئے ہیں، وہ فلسفے اور مذہب میں مشترک ہیں۔ ایم ایم شریف رقم طراز ہیں:

"The Qur'an is a book essentially religious, not philosophical, but it deals with all those problems which religion and philosophy have in common. Both have to say something problem related to the significance such expression as God, the world, the individual soul, and interrelations to these; good and evil, free- will, and life after death. While dealing with these problems it also throws light on such conceptions as appearance and reality, existence and attribute, human origin and destiny, truth and error, space and time, permanence and change eternity and immortality."

"قرآن بنیادی طور پر مذہبی کتاب ہے، فلسفے کی کتاب نہیں ہے، لیکن قرآن یہاں تمام مسائل سے بحث

۱- THE ROUTLEDGE COMPANION TO ISLAMIC PHILOSOPHY by Edited Richard C. Taylor p. 26-28.

کرتا ہے جو مذہب اور فلسفہ میں مشترک ہیں۔ دونوں کو ان مسائل پر کچھ کہنا ہوتا ہے جو ان تصورات سے متعلق ہوتے ہیں جیسے خدا، دنیا، فرد کی روح، اور ان کے آپسی تعلقات؛ خیر و شر، آزادی ارادہ، اور موت کے بعد کی زندگی۔ ان مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن ان تصورات پر بھی روشنی ڈالتا ہے جیسے ظاہر و حقیقت، وجود و صفات، انسانی ابتدا اور مقدر، حق و باطل، زمان و مکان، تغیر و بقا، ابدیت اور لافانیت۔"[۲]

پہلے نقطۂ نظر کی طرف واپس آتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں فلسفیانہ موضوعات یونانی تراجم سے ہی پہنچے ہیں، ورنہ اس سے پہلے کوئی فلسفیانہ بحث مسلم روایت میں نہیں پائی جاتی۔ جیسا کہ سید محمد کاظم صاحب نے بیان کیا ہے:

"اسلام سے پہلے عربوں میں فکر کی کوئی قابل ذکر روایت نہیں ملتی۔ اسلام نے آکر اپنے ماننے والوں کو ایک واضح اور مربوط تصور کائنات دیا اور ساتھ ہی انہیں اس عالم اور اس کے مظاہر میں فکر و تدبر کرنے اور اگلی تہذیبوں کے حالات پڑھ کر ان سے سبق سیکھنے کی ترغیب دی۔ اسلام کے پیغام کو لے کر مسلمان ایک قوت بن کر ابھرے اور کچھ ہی عرصے میں ان کا اقتدار دور دور تک پھیل گیا۔ اس پھیلاؤ کے نتیجے میں وہ قدیم علم و معرفت کے آثار سے روشناس ہوئے۔ یونان کا فلسفہ اور سائنس، ایران کی ادبی اور سیاسی دانش، ہندوستان کی طب اور ریاضیات۔ یہ سب اخذ و استفادے کے لیے ان کی دسترس میں آگئے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس چیج کا بھی سامنا ہوا کہ عقلی معیاروں پر پورا اترنے کے لیے وہ اپنے مذہب میں اسی طرح کی لچک اور توانائی پیدا کریں جو مشرق قریب کے دوسرے مذاہب یہودیت اور نصرانیت نے بڑی کوششوں کے بعد اپنے اندر پیدا کی تھی۔ مسلم علماء و فقہاء کا مقابلہ مفتوحہ قوموں اور یہود و نصاریٰ کے ایسے متکلمین سے ہوا جو فلسفہ اور منطق سے پوری طرح لیس تھے۔ علماء نے پہلے تو اپنے عقیدے کے زور پر ان لوگوں کے سوالات اور اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن جب اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی تو انہیں بھی عقلی دلائل سے کام لینا پڑا اور اس کے لیے انھوں نے فلسفے اور منطق کا سہارا لیا۔ اس طرح مسلمانوں میں علم کلام کا آغاز ہوا جس نے آگے چل کر باقاعدہ فلسفے کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن علم کلام کی ابتدا سے پہلے مسلمانوں کے اندر کچھ ایسے فرقے پیدا ہوئے جن کے وجود میں آنے کی وجہ ان کی خاص سیاسی فکر تھی جو بعد میں دینی فکر میں بدل گئی۔"

(مسلم فکر و فلسفہ ۹)

علم الکلام جو مسلم فکر سے شروع ہوتا ہے کیا وہ کوئی خارجی محرکات رکھتا ہے، جیسا کہ کاظم صاحب فرمار ہے

۲- A history of Muslim philosophy edited by M.M Sharif p.136.

ہیں یا یہ مسلم تہذیب کے اپنے اندر سے پیدا کردہ مسائل کے حل کے نتیجے میں پھوٹا ہے، یہ دیکھنا بہت اہم ہے کہ یونانی تراجم تو بہت بعد کی بات ہے، اس سے پہلے مسلم تاریخ میں خارجی، شیعہ، جبریہ، قدریہ، جہمیہ، وعدیہ پیدا ہو چکے تھے۔ یہ تمام تحریکیں کسی بھی خارجی اثر کے بغیر مسلم تاریخ میں نمایاں نظر آتی ہیں، خاص طور پر جبریہ اور قدریہ تو خاص طور پر فلسفیانہ مبحث ہی کے ایک طرح سے بانی ہیں۔

ماجد فخری علم الکلام کے پس منظر میں مسلمانوں کے سیاسی حالات کے بارے میں تبصرہ کر کے کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"Much more important for our purposes than the religious political factions discussed above are the more strictly theological divisions which began to split the ranks of Islam from the earliest times but apparently gained momentum with the introduction of Greek philosophy in the eighth and ninth centuries.

Most ancient authorities agree that the first abstract issue on which the earliest theological controversies hinged was the question of free will and predestination (qadar). Some of the first theologians to discuss this subject were Ma'bad al-Juhani (d. 699), Ghailan al-Dimashqi (d. before 743), Wasil bin Ata' (d. 748), Yonus al-Aswari, and 'Amr bin 'Ubaid (d. 762). Other theologians, like the famous Hasan al-Basri (d. 728)."

"ہمارے مقاصد کے لیے مذہبی سیاسی گروہوں کے مقابلے میں زیادہ اہم وہ مخصوص نظریاتی اختلافات ہیں جو ابتدائی زمانوں سے ہی اسلام کے مختلف گروہوں میں تقسیم کا سبب بنے، لیکن یہ اختلافات آٹھویں اور نویں صدی میں یونانی فلسفے کے تعارف کے ساتھ بظاہر مزید شدت اختیار کر گئے۔

زیادہ تر قدیم مآخذ اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی مذہبی مباحث کا پہلا مجرد مسئلہ جبر و قدر کا سوال تھا۔ ان ابتدائی علما میں جو اس موضوع پر بحث کرتے نظر آتے ہیں، معبد الجُہنی (وفات: ۶۹۹ء)، غیلان الدمشقی (وفات: ۷۴۳ء)، واصل بن عطا (وفات: ۷۴۸ء)، یونس الاسوری، اور عمرو بن عبید (وفات: ۷۶۲ء) اور دیگر علما، جیسے کہ مشہور حسن البصری (وفات: ۷۲۸ء)، شامل ہیں۔"[۳]

۳- A history of Islamic Philosophy by Majid fakhri COLUMBIA UNIVERSITY PRESS p. 44.

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جبر و قدر کا مسئلہ جو کہ ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے، وہ مسلم تہذیب کے خود اندر سے پھوٹا ہے اور دونوں گروہ اس کے لیے دلائل قرآن سے بیان کر رہے ہیں اور اس پر فلسفیانہ تدبر بھی جاری ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ یونان ہے۔ بلکہ Jon Mc Ginnis نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ معاملہ اس کے الٹ ہے کہ مسلم مفکرین ان سے فلسفہ اخذ کر رہے ہیں، بلکہ وہ فلسفی کلامی مباحث میں دل چسپی لے رہے تھے، بلکہ وہ یہاں تک اس سلسلے میں بیان کرتا ہے کہ یہ تاریخی اعتبار سے کہنا بیوقوفی ہو گی کہ اس وقت کے فلاسفہ کو کلامی مبحث کا علم نہیں تھا یا وہ ان میں دل چسپی نہیں لے رہے تھے۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

> "There were interesting theological debates going on within Islam itself as well as between Muslims and Greek, or more precisely, Syrian Christians. It thus would be foolish, and historically inaccurate, to think that the falasifa (i.e., the practitioners of falsafa) were not aware of these theological debates, for the philosophers did react to such discussions. Still, it is with the translation of Greek philosophical and scientific works that falsafa arises within the medieval Arabic-speaking world as an independent intellectual enterprise"

> "اسلام کے اندر خود بھی دل چسپ کلامی مباحثے ہو رہے تھے، اور ساتھ ہی یونانی، یا زیادہ درست الفاظ میں شامی عیسائیوں کے درمیان بھی مکالمے جاری تھے۔ اس لیے یہ سوچنا بیوقوفی اور تاریخی لحاظ سے غلط ہو گا کہ فلاسفہ ان کلامی مباحث سے ناواقف تھے، کیونکہ فلاسفہ نے ان مباحث پر ردعمل ظاہر کیا تھا۔ تاہم، یہ یونانی فلسفیانہ اور سائنسی کاموں کے تراجم کے ذریعے سے ہی ممکن ہوا کہ فلسفہ عربی بولنے والی دنیا میں ایک آزادانہ فکری شعبے کے طور پر ابھرا۔"[۴]

پیراگراف کے آخر میں، مگر وہ الٰہیات اور فلسفے میں تقسیم کر رہے ہیں، مگر یہ تقسیم فلسفے کی بنیادی تعریف میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم آج تک دیکھتے ہیں کہ کوئی ایک بھی شعبہ ہاے زندگی نہیں ہے جس پر فلسفے نے کلام نہ کیا ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ علم الکلام کو فلسفہ نہ مانا جائے گو علم الکلام یونانی فلسفے کے تراجم مسلم دنیا میں رواج پانے سے پہلے ہی اپنی حیثیت منوا چکا تھا۔ اب ذرا ہم ایک نظر اس نکتے پر ڈال لیتے ہیں کہ علم الکلام کے خود کیا معنی ہیں تا کہ اس مسئلے کا تصفیہ کیا جا سکے۔ سید حسین نصر نے جو مسلم فلسفے کی تاریخ مرتب کی ہے، اس میں

۴- Classical Arabic Philosophy by Jon Mc Ginnis and David C. Reisman 2007 by Hackett Publishing Company, Inc. p. xvii.

محمد عبد الحلیم صاحب اپنے آرٹیکل میں بیان کرتے ہیں کہ:

Kalām here means discussion on theological matters. As M. Abd al-Raziq has rightly observed, such discussions were called kalām before the science of kalām became independent and recorded in writing, and people who engaged in such discussions were also called mutakallimun. When books were written about these issues, the science which was written down was given the title that had been applied earlier to such discussions. In Islamic sources a number of reasons were offered for giving such a title to the science of kalām. Taftazanl (d. 793/1390) 6 put together such reasons as follows:

1. traditionally the title that was given to the discussions of any separate issue, was al-kaldm ft kalamd wa kathd (an exposition of/a chapter or section on).

2. The question of kalam Allah (the speech of God) was the most famous question and the one that gave rise to the most disputes.

3. The science of kaldm generates in one the power to talk about or discuss religious matters and impress one's arguments on one's rivals as logic does in the field of philosophy. As regards the first reason, it is true that chapters in such early books as al-Ibdnah of al-Ash'ari (d. 324/935) and al-Mughm of Abd al-Jabbar (d. 415/1024) bear such titles but these works appeared much later than the name of kaldm as a science. The same can be said of the second reason, since the title was well known before the discussions on kalam Allah (the createdness or otherwise of the Qur'an).

Similarly, the third suggestion refers to the stage when logic and Greek philosophy became well known and influential in the Islamic cultural milieu in the third/ ninth century, after the title of kalam had become well established.

”کلام سے یہاں مراد الٰہیاتی مسائل پر گفت و شنید ہے۔ جیسا کہ ایم عبدالرزاق نے درست طور پر مشاہدہ کیا ہے، ایسے مباحث کو ”کلام“ کہا جاتا تھا۔ اس سے پہلے کہ علم کلام ایک خود مختار علم کے طور پر ابھرتا اور لکھا جانے لگتا۔ وہ لوگ جو ان مباحث میں حصہ لیتے تھے، انھیں بھی ”متکلمین“ کہا جاتا تھا۔ جب ان موضوعات پر

کتابیں لکھی گئیں تو وہ علم جو لکھا گیا، اسے وہی نام دیا گیا جو پہلے ان مباحث پر لاگو ہوتا تھا۔ اسلامی ماخذوں کے مطابق علم کلام کو یہ نام دینے کی کئی وجوہات پیش کی گئی ہیں۔ تفتازانی (وفات ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء) نے ان وجوہات کو کچھ یوں بیان کیا:

۱۔ روایتی طور پر کسی مخصوص مسئلے پر مباحثے کا عنوان "الكلام فی كذا و كذا" (یعنی فلاں فلاں چیز پر بحث) دیا جاتا تھا۔

۲۔ "کلام اللہ" (یعنی کلام اللہ حادث ہے یا قدیم) کا سوال سب سے مشہور مسئلہ تھا اور اسی نے سب سے زیادہ تنازعات کو جنم دیا۔

۳۔ علم کلام انسان میں الٰہیاتی امور پر بات کرنے یا بحث کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور مخالفین پر اپنے دلائل کو مضبوطی سے پیش کرنے میں مدد دیتا ہے، جیسے کہ فلسفے میں منطق کا کردار ہے۔

جہاں تک پہلے نکتہ کا تعلق ہے، یہ سچ ہے کہ ابتدائی کتابوں جیسے کہ الاشعری (وفات ۳۲۴ھ/۹۳۵ء) کی "الابانہ" اور عبدالجبار (وفات ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء) کی "المغنی" کے ابواب ایسے ہی عنوانات کے حامل تھے، لیکن یہ کتابیں اس وقت سامنے آئیں جب علم کلام کا نام پہلے ہی ایک علم کے طور پر قائم ہو چکا تھا۔ دوسرے نکتہ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ "کلام اللہ" (قرآن کے مخلوق ہونے یا نہ ہونے کے حوالے سے) پر بحث کے شروع ہونے سے پہلے ہی یہ نام معروف تھا۔

اسی طرح، تیسرا نکتہ اس دور کا حوالہ دیتا ہے جب منطق اور یونانی فلسفہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں اسلامی ثقافتی ماحول میں معروف اور موثر ہوئے، جب کہ اس وقت تک "کلام" کا نام ایک علم کے طور پر مستحکم ہو چکا تھا۔"[۵]

اس کے بعد بھی اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ قرآن نہیں، یونان ہے تو ان کے حضور یہی درخواست کی جا سکتی ہے کہ یونانی اثر سے انکار نہیں وہ اپنی جگہ ایک تاریخی واقعہ ہے، مگر قرآن نے جو اس قوم کو غور و فکر کی دعوت دی تھی، وہ ایمان سے بڑھ کر ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اب وہ ہر ایک مسئلے پر سوچنے سمجھنے اور حکم لگانے کی پوزیشن میں آ چکے تھے۔ کوئی بھی تہذیب اپنی جڑیں اپنی تہذیب میں ہی رکھتی ہے، ورنہ وہ تہذیب آندھیوں کی زد میں ہی رہے گی، جب کہ ہم نے دیکھا کہ مسلم تہذیب نے

۵- History of Islamic Philosophy, EDITED BY Seyyed Hossein Nasr and Oliver Leamano Digital Printing 2008. P 150.

کس طرح اس دنیا کو علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ کسی بھی تہذیب پر بیرونی اثرات ضرور ہوتے ہیں، مگر اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس پر ردعمل کا اظہار کس طرح کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے درست سمت میں توجہ دلائی ہے:

”یہ کہنا کہ مسلم فلسفہ محض فلسفۂ یونان کا چربہ ہے اور اس کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں، جیسا کہ بعض مستشرقین نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مبنی بر انصاف دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات خود ان فطری قوانین کے بھی خلاف ہے جن کے تحت ثقافتی ورثے قوموں میں منتقل ہوتے ہیں ہملٹن گرے نے اس سلسلے میں تین قوانین کا ذکر کیا ہے۔

پہلا قانون یہ ہے کہ جب ایک ثقافت کسی دوسری ثقافت سے اثر قبول کرتی ہے تو مقدم الذکر میں پہلے ہی سے اس نوعیت کے اثرات موجود ہوتے ہیں۔

دوسرا قانون یہ ہے کہ بیرونی اثرات اس وقت تک پروان نہیں چڑھتے جب تک خود اندرونی رجحانات ان کی تربیت نہ کریں اور ان کے لیے زمین ہموار نہ کریں۔

تیسرا قانون یہ ہے کہ کوئی قوم ان بیرونی اثرات کو قبول نہیں کرتی جو اس کی اپنی بنیادی اقدار، ہیجانی میلانات اور جمالیاتی پیمانوں سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔“ (مسلم فلسفہ ڈاکٹر خالق صفحہ ۲۷)

میرے نزدیک آج بھی جدید مغربی فلسفے کا اثر لینے کے باوجود مسلم فلسفے میں ماخذ کی حیثیت قرآن ہی کو حاصل رہے گی۔ اس کی جدید مثال کے لیے علامہ اقبال کی “Reconstruction of religious thought in Islam” کو دیکھا جا سکتا ہے، یعنی آج بھی کوئی مسلم اپنی فکر کو فلسفیانہ موضوعات میں صرف کرتا ہے، اس کے لیے یہ چارہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کو نظر انداز کر دے، چہ جائیکہ ہم یہ کہیں کہ اسے ماخذ کے طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی میں مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ اولیں قرآن ہی ہے، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، نہ کہ کوئی نقطۂ نظر۔

کوکب شہزاد

توبہ کا قانون

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنایا اور اس کے بنانے کے مقصد کو بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ واضح کر دیا ہے کہ وہ آزما کر دیکھے کہ کون اچھے کام کرتا ہے اور کون برے کام کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو آخرت کی زندگی بنانی ہے، اس کے لیے لوگوں کا انتخاب کر سکے۔ آخرت کی زندگی ہمیشہ کی ہو گی، اس میں کوئی بڑھاپا نہیں ہو گا اور نہ کوئی بیمار، اس کی نعمتیں بہت اعلیٰ ہوں گی اور ان میں کبھی کمی نہ ہو گی۔ ہر نعمت ہر دفعہ نئی شکل اور نئے ذائقہ کی ہو گی۔ برتن سونے اور چاندی کے ہوں گے اور محل اور گھر سونے اور چاندی سے بنے ہوں گے۔ اور فرشتے ہر طرف سے ان مومنوں پر سلامتی بھیجیں گے۔ مومنین جدھر دیکھیں گے، ادھر نعمت ہی نعمت ہو گی۔ اس زندگی سے انسان کبھی نہیں اکتائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی خوب صورت طریقے سے اس دنیا کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ سورۂ ملک میں بیان ہوا ہے:

اَلَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا. (۶۷: ۲)

”(وہی) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔“

اس بہترین جنت کے لیے وہ انسانوں کو چن رہا ہے۔ اس وقتی اور عارضی زندگی میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو رکھ کر ان کا امتحان کر رہا ہے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے اور کون برے اعمال کرتا ہے۔

اپنی اس اسکیم کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے کیا تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ انسان کو اختیار دے کر آپ انھیں دنیا میں بھیجیں گے تو وہ اپنی من مانی کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں

بتایا کہ جب جب انسان اس دنیا میں فساد پیدا کرے گا، میرے نبی اور رسول آکر انھیں ہدایت کی طرف بلائیں گے اور انھیں غلط کاموں سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ اور جو برائی کے راستے پر ڈٹے رہیں گے تو میں ان سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اگر ان سے نادانستگی میں غلطی ہو جائے گی اور وہ فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ انھیں ضرور معاف کریں گے اور ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ بھی معاف کر دیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو بنایا اور پہلا امتحان انھی سے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو ایک باغ میں رکھا اور ان سے کہا کہ اس باغ سے جہاں سے چاہے کھاؤ پیو، لیکن اس خاص درخت کے قریب نہ جانا اور نہ اس کا پھل چکھنا، ورنہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بن جاؤ گے، مگر شیطان نے اپنی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے انھیں ہر طرح سے بہکانے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کی اس نافرمانی کرنے کے بڑے حسین خواب دکھائے۔ اس نے آدم اور حوا سے کہا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے تمھیں ہمیشہ کی زندگی ملے گی اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ تمھیں ہمیشہ کی زندگی ملے، اس لیے تمھیں اس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا ہے (وہ درخت کیا تھا، اس کا ذکر ہم کسی پچھلے مضمون میں تفصیل سے کر چکے ہیں)۔ اس طرح آدم اور حوا نے اس کے بہکاوے میں آکر اس باغ کا پھل کھا لیا اور اپنے امتحان میں ناکام ہو گئے۔ انھیں جونہی اپنی غلطی کا احساس ہوا، انھوں نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو معاف کر دیا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۳ میں ہے:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ۜ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ.

”اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

اس پہلے واقعہ سے ہی معلوم ہوا کہ گناہ چاہے دانستہ کیا ہو یا غیر دانستہ یا پھر کسی کے بہکانے پر گناہ کا احساس ہوتے ہی فوراً اپنے رب سے معافی مانگو اور اپنی اصلاح کر لو تو اللہ تعالیٰ اپنے رحم کی چادر آپ پر اوڑھا دے گا اور آپ کی غلطیوں کو اچھائیوں میں بدل دے گا۔

سورۂ قیامہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک چھوٹی عدالت لگا رکھی ہے، جسے ہم ضمیر یا نفس لوامہ کے نام سے جانتے ہیں۔ ہم جونہی کوئی غلط کام کرتے ہیں تو یہ عدالت ہمیں فوراً ڈانٹتی ہے اور ہمیں بے چین

کر دیتی ہے کہ تم نے یہ کام غلط کیا ہے۔ ہمیں کسی پل چین نہیں آتا۔ ضمیر نام کی یہ عدالت دنیا کے ہر انسان میں ہوتی ہے۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والے حبشی ہوں یا امریکا کے مہذب لوگ۔ اس طرح یہ چھوٹی عدالت ایک بڑی عدالت کی گواہی دیتی ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ قیامت کو برپا کرے گا اور انسان کے تمام اعمال کا حساب کرے گا جو اعمال ہم نے دنیا میں کیے۔ انھی اعمال پر ہمارے جنتی یا دوزخی ہونے کا انحصار ہو گا۔ اگر ہم سے اس دنیا میں غلطی ہو جائے اور ہم فوراً معافی مانگ لیں تو اللہ پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ہماری توبہ کو قبول کرے اور ہماری کی گئی غلطیوں کو اچھائیوں میں بدل دیتا ہے۔ سورۂ قیامہ میں ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ. وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ. اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ.(۷۵:۱-۳)

”(یہ قیامت کو جھٹلاتے ہیں)؟ نہیں، میں قیامت کے دن کو گواہی میں پیش کرتا ہوں، اور نہیں، میں (تمھارے اندر تمھارے) ملامت کرنے والے نفس کو گواہی میں پیش کرتا ہوں۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اِس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟“

قرآن مجید کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلطیاں جن کا احساس غلطی کرنے کے فوراً بعد ہو جائے اور انسان ان پر معافی مانگ کر اپنی اصلاح کر لے تو وہ فوراً معاف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ گناہ ہیں جن کی معافی انسان فوراً نہیں مانگتا، لیکن اتنی دیر بھی نہیں کرتا کہ موت کے قریب ہو جائے تو اس کے گناہ بھی قرآن کریم پڑھنے سے اندازہ ہوتا کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔ تیسری قسم کے وہ گناہ ہیں جن کو کرنے والا اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کرتا رہا، لیکن کبھی ان کی معافی نہیں مانگی، یہاں تک کہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے موت کو دیکھ لیا اور پھر موت کو دیکھ کر کہنے لگا کہ میں اللہ پر ایمان لایا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی توبہ کو میں قبول نہیں کروں گا۔

تیسری قسم کی توبہ میں فرعون کی مثال آتی ہے، جو مصر کا بادشاہ تھا اور اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ وہ ان پر بے انتہا ظلم کرتا تھا۔ دن بھر ان سے مزدوری لیا کرتا تھا اور معاوضہ بہت کم دیتا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ان کی نسل کشی کے لیے قتل کر دیتا اور ان کی عورتوں کو اپنی عیش و عشرت کے لیے زندہ رکھتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں کہ اس میں بنی اسرئیل کے لوگوں کے لیے بہت سخت آزمایش تھی۔ ان کے ذہنوں پر غلامی کی مہر لگ چکی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اندر حضرت موسیٰ کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ انھیں فرعون کی غلامی سے آزاد کرائیں اور مصر سے نکال کر کسی اور جگہ آباد کریں اور ان کی اخلاقی اور مذہبی

تربیت کر سکیں۔

حضرت موسیٰ اپنے بھائی کے ساتھ فرعون کے دربار گئے اور اس سے کہا کہ میری قوم کو آزاد کر دو، میں انھیں مصر سے نکال کر ان کی تربیت کرنا چاہتا ہوں۔ فرعون نے ان کی اس بات کو قبول نہ کیا اور وارننگ کو نہ سمجھ سکا۔ جس وقت اس کو اور اس کی قوم کی طرف عذاب آتا تو توبہ کرتے اور جب وہ تکلیف دور ہوتی تو پھر وہی نافرمانی کرنے لگتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون پر کئی چھوٹے عذاب بھیجے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لڑکوں کو موت دینا شروع کر دی۔ جب فرعون نے دیکھا کہ اس کا اپنا بیٹا موت کے قریب ہو گیا ہے تو اس کی بیوی نے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کو جانے دو۔ یہ سارے عذاب ان کی وجہ سے آ رہے ہیں۔

چنانچہ ہمارے لیے توبہ کا جو قانون سمجھ میں آتا ہے، اس کے تین پہلو ہیں:

۱۔ غلطی ہو گئی ہے، ضمیر کی آواز سنتے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور معافی مانگو اور آیندہ کے لیے توبہ کرو۔ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ تمھیں معاف کرے گا اور اپنی مغفرت کی چادر تم پر تان دے گا۔

۲۔ کسی سے گناہ ہوا۔ اس کے ضمیر میں بے چینی اور خلش ہوئی، لیکن اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کر مسلسل لاپروائی کا مظاہرہ کرتا رہا، لیکن زندگی کے کسی موقع پر تنبہ ہوا۔ اس نے تنبہ ہوتے ہی توبہ کی۔ توبہ کرنے میں نہ بہت جلدی کی نہ بہت دیر کی تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو بھی معاف کر دیں گے۔

۳۔ ایسے لوگ جو ساری زندگی گناہ کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار توبہ کے مواقع ملتے رہے، لیکن توبہ نہیں کی۔ گناہ کی دنیا میں آگے بڑھتے رہے۔ گناہوں کے صحرا کے اندر گناہوں کو سراب سمجھتے ہوئے بھاگتے رہے تو اچانک موت کو سامنے دیکھ کر فرعون کی طرح کہا کہ میں ایمان لایا تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ایسی توبہ قبول نہیں ہو گی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا اور ابدی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

چنانچہ آیئے موت سے پہلے اللہ تعالیٰ سے گذشتہ تمام گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اپنی اصلاح کر کے اپنے رب کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کی ابدی نعمتوں کے حق دار بن سکیں۔

شاہد رضا

پاکستان میں مندر کی تعمیر

[جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو سے اخذ و استفادہ پر مبنی]

سوال: کیا پاکستان میں ہندو مندر تعمیر ہونا چاہیے؟

جواب: پاکستان دور جدید کی ایک قومی ریاست ہے۔ قومی ریاست اس اصول پر بنائی جاتی ہے کہ ایک خاص خطۂ ارض میں جو لوگ رہ رہے ہیں، وہ برابر کے شہری ہیں۔ جب وہ برابر کے شہری ہیں تو حکومت بھی ان سب کی نمایندہ ہوتی ہے۔ وہ سب ٹیکس دیتے ہیں اور حکومت کا نظم ان کے ذریعے سے چلتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حکومت چلانے کے لیے جو ذمہ داریاں شہریوں پر ڈالی گئی ہیں، وہ صرف مسلمانوں پر ڈالی گئی ہیں، بلکہ غیر مسلموں پر بھی ڈالی گئی ہیں۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں ۸۰ سے ۸۵ فی صد یا اس سے بھی زیادہ مسلمان ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ملائشیا میں ۵۶ سے ۵۷ فی صد مسلمان ہیں، باقی زیادہ تر غیر مسلم ہیں۔ ایسی ریاستیں بھی ہیں جن میں ۵۰ فی صد یا ۹۸ فی صد مسلمان ہیں۔

چنانچہ جو بھی قومی ریاستیں ہوں گی، ان میں چونکہ سب شہریوں کی نمایندگی ہو گی اور سب شہری برابر کے حقوق رکھتے ہیں، اس لیے اس پر ہر ایک کے حقوق کی پاس داری کرنا لازم ہے۔ ان کے لیے مندر، سیناگوگ اور مسجدیں بھی بنیں گی۔ جب حکومت نے یہ طے کر لیا کہ وہ شہریوں کے معاملات میں تعاون کرے گی تو یہ تعاون سب کے ساتھ کرنا ہو گا۔ ایک قومی ریاست میں آپ کسی قسم کی تفریق نہیں کر سکتے، یعنی اگر یہ طے کر لیا ہے کہ ہر کمیونٹی نے اپنی عبادت گاہ خود بنانی ہے تو آپ کو اس کے لیے بھی سہولت اور اجازت دینی پڑے گی۔ اگر یہ طے کیا ہے کہ اس میں ریاست بھی تعاون کرے گی، مثلاً ریاست جگہ دے گی یا تعمیر کے لیے کچھ معاونت کرے گی تو چونکہ آپ تمام فرقوں، تمام گروہوں اور تمام مذاہب کے ماننے والے لوگوں کی ریاست بنا کر قومی ریاست کے طور پر اس کا نظم چلا رہے ہیں، اس لیے آپ کو سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا چاہیے۔ اس سے

کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ اسلام آباد ہے یا اس میں ہندوؤں کی تعداد کیا ہے۔

اگر ان کی یہ ضرورت ہے کہ اسلام آباد میں ان کے لیے ایک مندر ہونا چاہیے تو ان کو اپنے طور پر بھی بنانے کا حق ہے۔ اگر ریاست مسجدوں کے معاملے میں تعاون کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو پھر اسے مندر کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ قومی ریاست کا اصول یہی ہے۔ اس وقت دنیا میں جو ریاستیں بھی ہیں، انھیں اپنی حیثیت پہلے متعین کر لینی چاہیے۔ دور حاضر میں ان کی حیثیت پرانے دار الاسلام یا دار الکفر یا دار الحرب کی حیثیت نہیں ہے۔ وہ فقہ اب دنیا سے رخصت ہو چکی ہے اور وہ دور بھی چلا گیا ہے۔ یہ اسلام کی اصطلاحات نہیں تھیں، بلکہ یہ اس زمانے کی فقہ کی اصطلاحات تھیں۔ ظاہر ہے کہ اُس دور میں یہ چیزیں اپنی ایک معنویت رکھتی تھیں، مگر اب ہم قومی ریاستوں کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگر آپ کو کچھ تبدیل کرنا ہے تو پہلے اس بنیاد کو تبدیل کیجیے، لیکن اگر اسی بنیاد پر ریاستیں منظم ہیں تو یہ قومی ریاستیں ہیں۔

قومی ریاست بنانا اور قومی ریاست میں رہنا، یہ کوئی مذہبی لحاظ سے جرم نہیں ہے، لیکن جب اس کو بنا لیا گیا ہے تو ہر جگہ مندر بنانے کا یہ مطالبہ برحق ہو گا۔ اگر ہم امریکا میں رہ کر یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہمیں مسجد بنانے کی اجازت دی جائے یا اگر امریکا کی حکومت چرچ کی مدد کرتی ہے تو مسجد کی بھی مدد کرے تو میں یہی مطالبہ کرنے کا حق پاکستان میں بھی رکھتا ہوں۔

اس حوالے سے استثنا صرف ایک سرزمین کا ہے اور وہ سرزمین عرب ہے۔ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ وہاں مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے دین کا کوئی شخص اپنی کوئی مستقل اقامت بھی نہیں رکھ سکتا۔ وہ عارضی طور پر ہی جائے گا اور اگر اس نے کوئی عبادت کی چیز بھی کرنی ہے تو عارضی طور پر ہی کرے گا۔ چنانچہ یہ سرزمین عرب یا سرزمین حجاز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہے، اس لیے کہ اس کی حیثیت مسجد کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا ہے کہ:

لا يجتمع دينان في جزيرة العرب.
(موطا امام مالک، رقم ۱۵۸۴)

”جزیرہ نماے عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔“

چنانچہ سرزمین عرب میں کوئی دوسرا دین نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ باقی دنیا میں سب قومی ریاستیں ہیں۔ قومی ریاست کا یہی اصول ہے کہ سب کے حقوق برابر ہیں۔[1]

۱-https://ghamidi.com/videos/should-hindu-temples-be-built-in-pakistan-3810

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۵)

انسانی کتب اور کلام الٰہی کا سبقاً سبقاً پڑھنا

ہمارے ہاں اکثر لوگ قرآن مجید کے بجائے کسی اور مذہبی کتاب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ امین احسن اس رویے پر بہت دکھی ہوتے تھے۔ ممتاز مدرس قرآن قاضی محمد کفایت اللہ امین احسن کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... میری نادانی دیکھیے کہ میں نے ... امام اصلاحی سے یہ گزارش کر دی کہ میری آمد کا ایک اور اہم مقصد یہ بھی تھا لیکن اس کے اظہار کی مجھے جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ میں آپ سے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی "حجۃ اللہ البالغہ" سبقاً سبقاً پڑھنا چاہتا ہوں۔ میری اس گزارش کا پس منظر یہ تھا کہ میں ان دنوں علامہ عبید اللہ سندھی کے زیر اثر امام دہلوی کی کتب و رسائل کے حصول اور ان کے بیان کردہ حقائق و معارف کے اخذ و کسب کا دیوانگی کی حد تک وارفتہ ہو چکا تھا۔ بہر حال جیسے ہی امام اصلاحی نے میری زبان سے "حجۃ اللہ البالغہ" کے سبقاً سبقاً پڑھائے جانے کی استدعا سنی تو میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرے پر جلال کے آثار نمودار ہو گئے۔ آپ جلالی انداز میں فرمانے لگے کہ اے نوجوان فاضل، اللہ تعالیٰ کے آخری کلام کے آجانے کے بعد، آپ ابھی تک انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں اور حجتوں کے سبقاً سبقاً پڑھے جانے کا اپنے آپ کو محتاج پاتے ہو۔ کچھ تو اپنا اور اپنے رب کا مقام پہچانو۔ اللہ تعالیٰ کی آخری حجت کو سبقاً سبقاً گہرائی میں اتر کر پڑھنے کے بجائے تم انسانوں کی حجتوں کو پڑھنے پڑھانے کے لیے دنیا بھر کی خاک چھان رہے ہو۔ خدا کے لیے اس دلدل سے نکلو، میرے پاس اللہ کی کتاب کو پڑھانے کے علاوہ

کسی دوسری کتاب کو سبقاً سبقاً پڑھانے کے لیے ایک منٹ بھی فارغ نہیں ہے۔ اگر تم نے یہی کام کرنا ہے تو اس خدمت کے لیے میرے سوا کسی دوسرے شخص کو تلاش کرو۔ اس معاملے میں تمھارا یہ انتخاب بہت ہی غلط ہے۔ لیکن میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں جلد انسانوں کی لکھی ہوئی حقیر تصنیفات کے جنجال سے نجات دے کر اپنی کتاب کی طرف رغبت دے۔

امام اصلاحی کے اس جلالی رویے کو دیکھ کر میرے اندر دوبارہ ان سے براہِ راست ملاقات کرنے کا یارا نہ رہا۔ البتہ دو چار دفعہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں آپ کے درس قرآن کی کچھ نشستوں میں حاضری کا شرف تو حاصل ہوا لیکن آپ کا قرب حاصل کرنے کا میرے اندر حوصلہ نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ملاقات نے مجھے خوابِ غفلت سے جگا دیا۔"

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۵۳)

خلوص و محبت

امین احسن سراپا خلوص و محبت تھے۔ وہ صرف اپنوں کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ غیروں کے ساتھ بھی بڑی محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

"مجھے ان سے ملاقات کا شرف صرف ایک بار اس وقت حاصل ہوا جب وہ اپنے والد کی علالت کی خبر سن کر ۱۹۵۲ء میں ہندوستان اپنے آبائی وطن تشریف لائے تھے۔ مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت دونوں ملکوں کے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ پھر ان کا تعلق جس جماعت سے تھا اس کی وجہ سے انھیں گاؤں سے کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ان سے وہیں ملنے گیا تو بڑے لطف و محبت سے پیش آئے۔ میرے بڑے بھائی مولوی قمر الدین اصلاحی کے بارے میں دریافت کیا جن کا قلمی و ادبی نام قمر اعظمی ہے اور جن کو انھوں نے پڑھایا تھا۔ جب بھائی کے بارے میں انھیں معلوم ہوا کہ ان کا مشغلہ علمی نہیں ہے تو انھیں بڑا افسوس ہوا اور میرے ذریعے سے انھیں یہ پیغام بھیجا کہ آخر ان کے علم، ان کی ذہانت و صلاحیت سے ان کی قوم و ملت اور ملک کو کیا فائدہ پہنچا۔

میری موجودگی میں مغرب کے بعد ان سے ملنے کے لیے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ آئے اور عشاء سے پہلے واپس جانے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ اس وقت رات میں کیوں جا رہے ہیں؟ قاضی صاحب نے کہا: ہم لوگ قریب کے ہیں۔ ابھی پہنچ جائیں گے۔ مولانا نے فرمایا کہ قریب کے لوگوں کو ہی روکا جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے ہنس کر کہا: نہیں اجازت دیجیے، ہم لوگ بس نیاز حاصل

کرنے آئے تھے۔ مولانا نے فرمایا: اجی حضرت، میں تو خود ہی نیاز مند ہوں۔

میری ان سے یہی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ البتہ ان سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی۔ ''میثاق'' کے لیے ان کی طلب پر میں نے چند مضامین لکھے۔ وہ میرے عزیز بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ایک پوتے عزیزی ابوریحان جو افسوس ہے کہ دادری کے ہوائی حادثہ میں ۱۲/ نومبر ۱۹۹۶ء کو جاں بحق ہو گئے ان سے میری لڑکی شاہین منسوب تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اس رشتہ اور مولانا بدر الدین اصلاحی مرحوم کے نکاح پڑھانے کی انھیں اطلاع دی تو اس پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ تمھارا خط بہت مختصر تھا۔ اب جب خط لکھو تو دارالمصنفین اور مدرستہ الاصلاح کا مفصل حال لکھو اور دونوں جگہ میرے جو ملنے اور جاننے والے لوگ موجود ہیں ان کا ذکر کرو۔ اور ان سے میرا اسلام کہو۔ چنانچہ تعمیل حکم میں جب میں نے بڑا مفصل خط لکھا تو بہت خوش ہوئے اور جواب میں تحریر فرمایا کہ دراصل میں اسی طرح کا خط چاہتا تھا۔ اسی گرامی نامہ میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا ''میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر وہاں آؤں۔ چاہے میرے جاننے والے ہوں یا نہ ہوں۔ مدرستہ الاصلاح کے در و دیوار تو ہوں گے۔ ان ہی سے لپٹ کر اچھی طرح رو لوں گا''۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ انھیں مدرستہ الاصلاح سے جو ان کے استاد کی یادگار ہے، کتنا جذباتی تعلق تھا اور وہ اس کی ترقی و استحکام کے کس قدر آرزو مند رہتے تھے۔ وہ پاکستان میں ضرور تھے لیکن ان کا دل یہاں اور یہاں کے لوگوں میں بھی اٹکا رہتا تھا۔ اور جب یہاں کے کسی شخص کو پا جاتے تو فرط تعلق سے لپٹ جاتے تھے اور جو جو یاد آتا سب کا حال دریافت فرماتے۔

راقم کے ایک استاد مولوی قمر الزمان صاحب اصلاحی مرحوم، جو مولانا امین احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز تھے، جس سال حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اسی سال مولانا اصلاحی بھی پاکستان سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ ان سے ملنے گئے تو ان کے پاس کئی ملکوں کے اہم اور معزز اشخاص بیٹھے ہوئے تھے، لیکن ان کو دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور ان کی ساری توجہ کا مرکز یہی ہو گئے۔

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم ایک دفعہ ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے اعزاز میں ایک بڑی لمبی اور شان دار دعوت کا اہتمام کیا۔ سید صاحب فرماتے تھے کہ مجھے ایسی پر تکلف اور شان دار دعوت کھانے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ وہ مولانا اصلاحی کے گرم جوشی سے ملنے اور خلوص و محبت کا اکثر ذکر فرماتے اور کہتے کہ جو لوگ ان کے یہاں موجودگی کے وقت دارالمصنفین کے کسی شعبہ سے وابستہ تھے، ان سب کا نام لے کر ایک ایک شخص کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔

دراصل دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا تعلق تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی سے ملاقات کے لیے یہاں برابر آتے رہتے تھے اور خود سید صاحب بھی سرائے میر برابر تشریف لے جاتے تھے اور مولانا امین احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ ان کے بڑے صاحب زادے حکیم محمد فیاض پاکستان گئے اور ان سے ملے تو بڑی پذیرائی کی اور کہنے لگے مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ اگر کبھی بمبئی کے راستہ آیا تو تمھارے یہاں قیام کروں گا اور دہلی سے آنے پر عبداللطیف اعظمی صاحب کے یہاں قیام کروں گا۔ یہ بھی ان کے چہیتے شاگرد ہیں۔

مولانا امین احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کھانے پینے کے جتنے شوقین تھے اس سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر انھیں خوشی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں اکثر دعوتیں ہوتی تھیں۔ اعظم گڑھ میں حکیم محمد اسحاق صاحب اپنی حذاقتِ فن، شرافتِ نفس اور جامع صفاتِ حسنہ ہونے کی بنا پر ہر طبقہ میں بہت مقبول و محبوب تھے۔ مدرسۃ الاصلاح اور اس کے ذمہ داروں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا امین احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے بڑے بے تکلف اور خاص دوست تھے۔ حکیم صاحب کے نورتنوں میں مشہور شاعر جناب یحییٰ اعظمی اور دارالمصنفین کے رفقا اور وابستگان بھی تھے۔ ان سب کو مولانا اصلاحی سال میں دو مرتبہ اپنے دولت خانے پر مدعو کرتے۔ ایک تو جاڑے میں، جب ہرے مٹر اور گنا تیار ہوتا۔ اور دوسرے آموں کے موسم میں۔ حکیم صاحب کا سفر عموماً کشتی سے ہوتا تھا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو بھی ان دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔‘‘(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۱۲-۱۴)

امین احسن کے ایک شاگرد جناب محمود احمد لودھی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

’’اپنے شاگردوں سے دل بستگی اور ان کے حال پر شفقت اس درجے کی تھی کہ ہر شاگرد بجا طور پر ان کا چہیتا ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ ہمارے درس کے ایک ساتھی شیخ محمد صادق صاحب کو ایک شیخ وقت سے عقیدت ہو چلی تھی۔ اصلاحی صاحب انھیں ٹوکا کرتے تھے ’’دیکھنا کہیں ان کی بیعت نہ کر بیٹھنا‘‘۔ شیخ صاحب بالآخر باز نہ رہ سکے اور بیعت کر ڈالی۔ حلقہ کے درس میں ہمارے ایک ساتھی سلیم کیانی صاحب جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ مولانا کو ان کا پاس خاطر ملحوظ رہتا تھا۔ ان کی آزردگی اور دل آزاری کے مدنظر وہ درس کے دوران جماعت اسلامی پر مشکل ہی سے کوئی چوٹ کرتے تھے البتہ میں چھیڑ خانی کر دیتا اور جماعت اسلامی کے حق میں کوئی کلمۂ خیر شرارتاً کہہ دیا کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے مولانا کی ڈانٹ سننی پڑتی۔ آج میں صرف اس بات پر

فخر کر سکتا ہوں کہ میں نے تمام ساتھیوں سے زیادہ استاد کی ڈانٹ کھائی ہے۔“

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۹۸)

اسحاق ناگی صاحب، غامدی صاحب کے حلقے کے بڑے سرگرم رفیق تھے۔ وہ امین احسن کے درس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور ایک درس میں نہ جا سکے تو امین احسن نے ان کے بارے میں دریافت کیا۔ بتایا گیا کہ ان کا ایکسیڈینٹ ہو گیا۔ تو پوچھا کہ بھئی، آپ لوگوں میں سے کوئی ان کی عیادت کے لیے گیا ہے؟ ایک صاحب نے کہا: جی، میں گیا تھا۔ امین احسن نے کہا: میری طرف سے بھی پوچھیے گا... راقم نے نوٹ کیا کہ اسحاق صاحب جب انھیں ملنے جاتے اور ان سے مصافحہ کرتے تو وہ بہت دیر تک ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رکھتے اور بڑی شفقت و محبت سے ان کی طرف دیکھتے رہتے۔ ضعف کے باعث مولانا کہیں تھک نہ جائیں، یہ سوچ کر اسحاق صاحب بڑی آہستگی سے خود اپنا ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ راقم ان کے حلقۂ ارادت میں نووارد تھا، لیکن میرے مصافحہ کرنے پر وہ مجھے بھی اسی شفقت سے نوازتے۔

راضی بہ رضا

اس دنیاے فانی میں وہ شخص بہت خوش نصیب ہے جو راضی بہ رضا کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ امین احسن بھی ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں شامل تھے۔ نیو سنٹرل جیل، ملتان سے ۲۶ / اگست ۱۹۵۰ء کو اپنی خوش دامن صاحبہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آپ نے اپنے خط میں ہماری مدت قید کی توسیع پر پریشانی کا اظہار کیا ہے، لیکن انوار بالکل مطمئن تھیں۔ اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ کوئی شخص خدا کا وفادار بندہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی آزمایشوں میں اپنے آپ کو مستقل مزاج اور ثابت قدم نہ کر دے۔ مجھے دعویٰ تو کسی چیز کا بھی نہیں ہے، لیکن دعا برابر کرتا رہتا ہوں کہ قیامت کے دن خدا مجھے منافقین کے ساتھ نہ اٹھائے بلکہ سچے اہل ایمان کے ساتھ اٹھائے۔ اس کے لیے کم سے کم شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کے ساتھ چالبازی کرنے والا نہ ہو۔ مجھے خدا کے راستہ سے ہٹ کر جینے کے تصور سے بھی گھن آتی ہے۔ اس وجہ سے ہر آزمایش کے لیے تیار ہوں۔ اور میری کمزوریوں کے باوجود میرے پروردگار کا معاملہ میرے ساتھ ایسا حوصلہ بڑھانے والا ہے کہ اس کو میں ہی جانتا ہوں۔ وہ لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے جو خدا کی باتوں سے واقف نہیں ہیں۔ پس آپ لوگ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں جس جگہ ہوں اپنے پروردگار سے بالکل راضی ہوں اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کا معاملہ

میرے ساتھ غیر منصفانہ ہے۔ میرا جینا اور مرنا اللہ کے لیے ہے اور میں جس طرح دین کی خدمت کے لیے آزادی چاہتا ہوں اسی طرح اس کے راستہ میں قید و بند کو بھی پسند کرتا ہوں۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷۴)

ڈاکٹر عبد اللطیف خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری کتابوں کے چھپنے کا معاملہ اب بالکل مجہول ہو گیا۔ میرے پاس ایسے ذرائع نہیں کہ میں ان کو چھپوا سکوں اور ڈاکٹر صاحب پر مجھے اعتماد نہیں رہا۔ اس وجہ سے اب اس معاملے کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اگر اس کی مرضی ہو گی تو ان کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی ورنہ اپنے رب کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ البتہ لکھنا میری ذمہ داری ہے اور یہ کام میں آخر دم تک ان شاء اللہ کرتا رہوں گا۔ چونکہ آپ اس کام کے سب سے بڑے معاون اور قدر دان ہیں اس وجہ سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کے اور میرے اختلافات کی نوعیت عقائدی اور نظریاتی ہے اور امید نہیں کہ اب ان کے ساتھ اتفاق ہو سکے۔ اگرچہ اس حادثہ کا میرے دل و دماغ پر بہت برا اثر پڑا لیکن میں اس کو خدا کی طرف سے آزمایش سمجھتا ہوں اور اس سے صبر کی توفیق مانگتا ہوں۔

... نقل مکان کا ارادہ فروری کے آخر تک ہے۔ ابھی سردی بھی زیادہ ہے اور میری طبیعت بھی خراب ہے۔ تفسیر کا کام بحمد اللہ جاری ہے۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۲)

۶ر فروری ۱۹۷۳ء کو لاہور سے شیخ سلطان احمد کو خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ شکایت نہیں ہے کہ زمانے نے میری قدر نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس اہل زمانہ کے ذوق کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ میں اپنے کام پر بالکل مطمئن ہوں۔ البتہ اس حادثہ (مراد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے رویے سے بیزاری ہے۔ مدیر) کے بعد اب کسی نئے تجربے کی ہمت نہیں پا رہا ہوں۔ اس وجہ سے زندگی کے باقی انفاس تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ بزرگوں نے تنہائی کی بڑی برکتیں گنائی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اس کا بھی تجربہ ہو جائے۔ خدا کرے اس کا حق ادا ہو سکے۔

میری اور بعض دوسرے دوستوں کی بھی رائے یہی تھی کہ مارچ کے آخر تک روانگی ہو لیکن اہلیہ مستعجل ہیں۔ اس وجہ سے اغلب یہی ہے کہ اس مہینے کی آخری تاریخوں تک لاہور چھوڑ دیں گے۔ خدا کرے کوئی مانع پیش نہ آئے۔ آج میں نے فون والوں کو اطلاع کر دی ہے کہ میرا فون کاٹ دیا جائے۔

اب کراچی کا سفر کسی دوسرے موقع پر کروں گا۔ اس وقت تو رحمان آباد دماغ پر مستولی ہے۔ وہاں بڑا مسئلہ سر چھپانے کے لیے کسی جھونپڑے کا ہے۔ مگر اس سلسلے کا کوئی عملی حل اسی صورت میں ممکن ہے جب وہاں

جا کر ڈیرہ ڈال دیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ کوئی نہ کوئی شکل نکل ہی آئے گی۔ اب کتابوں کا بوجھ میں نے اپنے سر سے اتار دیا ہے۔ اب جو کچھ بھی کیجیے اس تصور کے ساتھ کیجیے کہ ان اوراق کا سیاہ کرنے والا دنیا سے رخصت ہو گیا۔" (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۲-۸۳)

صبر و تحمل

امین احسن صبر و تحمل کا وصف کس درجے میں رکھتے تھے، جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک حضرت مولانا مرحوم سے نصف صدی پر محیط تعلقات کا اہم ترین اور ناقابل فراموش واقعہ مولانا کے وہ چند تاریخی کلمات ہیں جو ان کی زبان سے اپنے صاحب زادے ابو صالح اصلاحی کی قاہرہ کے ہوائی حادثہ میں اچانک وفات کے موقع پر نکلے۔ حادثہ کی خبر سن کر ہم سب مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ غمزدہ نیاز مندوں کا ایک ہجوم تھا اور سب خاموش بیٹھے تھے کہ مولانا نے خود ہی مہر سکوت توڑی اور فرمایا "حضرات، میں خود ہی بات کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے جذبات کا پورا پورا احساس ہے جس کے لیے میں بہت ممنون ہوں۔ اس بات پر تو میرا قلب اور ذہن بالکل مطمئن ہیں کہ اللہ کی مشیت کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا ہے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ بس میری آپ حضرات سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں کہ اللہ کریم مجھے اس عمر میں یہ صدمہ صبر و تحمل سے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا کے یہی الفاظ میں نے اپنی چھوٹی بیٹی کی اچانک وفات کے موقع پر اعزہ اور احباب کے تعزیتی اجتماع میں دہرائے اور ان سے دل کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔ مولانا کے یہ تاریخی کلمات جہاں صبر و شکر، رضا بالقضاء اور توکل علی اللہ کا مظہر ہیں وہیں اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی کے غیر معمولی شعور پر بھی دلالت کرتے ہیں۔"

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۸۳-۸۵)

[باقی]

نعیم احمد

اشاریہ ماہنامہ ”اشراق“ ۲۰۲۴ء

قرآنیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	البیان: الصافات ۳۷: ۷۵-۱۴۸ (۲)	جاوید احمد غامدی	۷
فروری	البیان: الصافات ۳۷: ۱۴۹-۱۸۲ (۳)	〃	۸
مارچ	البیان: ص ۳۸: ۱-۱۶ (۱)	〃	۷
اپریل	البیان: ص ۳۸: ۱۷-۲۹ (۲)	〃	۷
مئی	البیان: ص ۳۸: ۳۰-۴۰ (۳)	〃	۹
جون	البیان: ص ۳۸: ۴۱-۸۸ (۴)	〃	۱۰
جولائی	البیان: الزمر ۳۹: ۱-۲۰ (۱)	〃	۱۵
اگست	البیان: الزمر ۳۹: ۲۱-۳۵ (۲)	〃	۷
ستمبر	البیان: الزمر ۳۹: ۳۶-۵۲ (۳)	〃	۸
اکتوبر	البیان: الزمر ۳۹: ۵۳-۷۵ (۴)	〃	۱۲
نومبر	البیان: المومن ۴۰: ۱-۲۲ (۱)	〃	۸
دسمبر	البیان: المومن ۴۰: ۲۳-۵۵ (۲)	〃	۷

معارف نبوی

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حجر اسود نصب کرنا	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۲۳
فروری	بہترین عمل	حدیث سیل/شاہد رضا	۱۳
مارچ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے ہی دین ابراہیم پر تھے	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۱۲
اپریل	علامات قیامت (۷)	جاوید احمد غامدی/ ڈاکٹر محمد عامر گزدر	۱۳
مئی	علامات قیامت (۸)	؍	۱۴
جون	یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں خبر دینا	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۱۹
جولائی	نبی ﷺ کے بعد مسلم حکومتیں	حدیث سیل/شاہد رضا	۲۶
اگست	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین نسل میں بعثت	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۱۴
ستمبر	بعثت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زید بن عمرو بن نفیل سے ملاقات	؍	۱۴
اکتوبر	بعثت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اور آپ کا زمانۂ رسالت	؍	۲۰
نومبر	علامات قیامت (۹)	جاوید احمد غامدی/ ڈاکٹر محمد عامر گزدر	۱۶
دسمبر	دن کی نفل نمازیں	حدیث سیل/شاہد رضا	۲۰

شذرات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	ترک دنیا	طالب محسن	۴
فروری	اسلام اور جدید ریاست	ً	۴
مارچ	رمضان اور روزہ	ً	۴
اپریل	قرآن: کتاب معرفت	ً	۴
مئی	فرقہ پرستی	ً	۴
جون	قربانی	جاوید احمد غامدی	۴
ً	غلطی کا تعین	طالب محسن	۶
جولائی	الحاد کا مقدمہ	جاوید احمد غامدی	۴
ً	دین سازی	طالب محسن	۱۳
اگست	انسان سے معاملہ	ً	۴
ستمبر	مسئلۂ قیادت	ً	۴
اکتوبر	دین فطرت	جاوید احمد غامدی	۴
ً	رسول اللہ کی سرگذشت	طالب محسن	۷
نومبر	شریعت میں تبدیلی	جاوید احمد غامدی	۴
دسمبر	تعلق باللہ	طالب محسن	۴

نقطۂ نظر

جنوری	قرآن میں ’اہل البیت‘ سے مراد کیا ہے؟(۱)	علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی / ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۵۲
فروری	قرآن میں ’اہل البیت‘ سے مراد کیا ہے؟(۲)	ً	۵۰
مارچ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے لفظ ’مسلم‘ کا وجود	مشفق سلطان	۴۵

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اپریل	بطور غیر مسلم اقلیت قادیانیوں کے مذہبی حقوق کا مسئلہ	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۵۴
مئی	حدیث: 'إن عليًا لا يحبه إلا مؤمن ولا يبغضه إلا منافق' کی تحقیق	علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی / ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۴۹
جون	ایک غلط فہمی	کوکب شہزاد	۶۰
اگست	حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے پہلی وحی کا تجربہ	؍	۳۸
؍	فکر اسلامی کو درپیش جدیدیت کے چیلنج اور مدارس اسلامیہ	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۴۷
اکتوبر	ہندومت اور تصور نبوت؟(۱)	مشفق سلطان	۴۸
نومبر	حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حدیث کذبات ثلاثہ کی تحقیق	ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی	۵۶
دسمبر	بچوں سے قرآن حفظ کرانا	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۳۹
؍	ہندومت اور تصور نبوت؟(۲)	مشفق سلطان	۴۶

نقد و نظر

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اگست	رفقاے المورد کے نام	محمد ذکوان ندوی	۵۹
ستمبر	مسلم فلسفے کی اصطلاح	سجاد بشیر	۶۲
دسمبر	مسلم فکر میں فلسفے کا ماخذ: یونان یا قرآن	؍	۵۲

شخصیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	حیات امین احسن (۴)	محمد بلال	۴۲
فروری	حیات امین احسن (۵)	؍	۳۸
مارچ	حیات امین احسن (۶)	؍	۴۰
اپریل	حیات امین احسن (۷)	؍	۴۸
مئی	حیات امین احسن (۸)	؍	۷۹

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جون	حیات امین احسن (۹)	محمد بلال	۷۹
جولائی	حیات امین احسن (۱۰)	"	۸۰
اگست	حیات امین احسن (۱۱)	"	۷۴
ستمبر	حیات امین احسن (۱۲)	"	۷۹
اکتوبر	حیات امین احسن (۱۳)	"	۷۲
نومبر	حیات امین احسن (۱۴)	"	۷۶
دسمبر	حیات امین احسن (۱۵)	"	۶۸

سیر و سوانح

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	مہاجرین حبشہ (۲۷)	محمد وسیم اختر مفتی	۶۲
فروری	مہاجرین حبشہ (۲۸)	"	۶۲
مارچ	مہاجرین حبشہ (۲۹)	"	۵۲
اپریل	حضرت اسماء بنت مخرّبہ رضی اللہ عنہا / حضرت سلمیٰ بنت صخر رضی اللہ عنہا	"	۶۱
مئی	مہاجرین حبشہ (۳۰)	"	۵۶
جون	مہاجرین حبشہ (۳۱)	"	۴۲
جولائی	مہاجرین حبشہ (۳۲)	"	۵۳
اگست	مہاجرین حبشہ (۳۳)	"	۳۰
ستمبر	مہاجرین حبشہ (۳۴)	"	۵۳
اکتوبر	مہاجرین حبشہ (۳۵)	"	۳۸
نومبر	مہاجرین حبشہ (۳۶)	"	۴۷
دسمبر	قبیلہ بنو عبدالدار کے مومن اور مشرک	"	۳۶

مقالات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	قرآن مجید میں اختلاط مرد و زن کے احکام (۵)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۳۱

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
فروری	قرآن مجید میں اختلاط مرد وزن کے احکام (۶)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۱۸
مارچ	نظم قرآن: چند توضیحات	〃	۳۰
اپریل	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۱)	ساجد حمید	۳۸
مئی	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۲)	〃	۳۸
جون	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۳)	〃	۳۳
جولائی	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۴)	〃	۳۱
〃	نسخ القرآن بالسنة: امام شافعی کے موقف پر اصولیین کے معارضات (۱)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۴۳
اگست	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۵)	ساجد حمید	۱۹
ستمبر	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۶)	〃	۲۳
〃	نسخ القرآن بالسنة: امام شافعی کے موقف پر اصولیین کے معارضات (۲)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۳۷
اکتوبر	'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟(۷)	ساجد حمید	۲۷
نومبر	میزان: توضیحی مطالعہ: اصول و مبادی (۱)	ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر	۲۹
دسمبر	میزان: توضیحی مطالعہ: اصول و مبادی (۲)	〃	۲۷

دین و دانش

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
مارچ	صحرا میں پھول	محمد ذکوان ندوی	۲۲
〃	رمضان اور خواتین کے مسائل	کوکب شہزاد	۲۶
اپریل	توبہ (۱)	محمد رفیع مفتی	۲۳
〃	اعتکاف کا مقصد	محمد ذکوان ندوی	۳۳
مئی	خدا پر ایمان	جاوید احمد غامدی	۲۸

اصلاح و دعوت

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	بچوں کو نفرت کی تعلیم	ڈاکٹر عرفان شہزاد	۶۸

اشاریہ

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	حضرت یوسف علیہ السلام نوجوانوں کے لیے مشعل راہ	کوکب شہزاد	۷۰
اپریل	حضرت لوط کی قوم پر عذاب کیوں؟	〃	۶۹
مئی	توبہ (۲)	محمد رفیع مفتی	۵۸
جون	توبہ (۳)	〃	۵۰
〃	کفر وشرک — ایک کردار	محمد ذکوان ندوی	۵۸
جولائی	زوال آدم خاکی	〃	۶۵
ستمبر	طلب حاجت یا ذکر و مناجات	〃	۶۵
〃	اللہ تعالیٰ کی قربت کا تجربہ	کوکب شہزاد	۷۰
اکتوبر	عدت اور چند مسائل	〃	۵۵
〃	قرآن اور ہمارے درمیان حائل رکاوٹیں	ڈاکٹر عدیل احمد	۶۱
دسمبر	توبہ کا قانون	کوکب شہزاد	۶۲

وفیات

مارچ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — چند یادیں	خورشید احمد ندیم	۷۵

یسئلون

جنوری	عہد الست	شاہد رضا	۷۸
فروری	موت ایک دروازہ!!	معاذ بن نور	۷۲
〃	دین اور مذہب	شاہد رضا	۷۹
مارچ	روزہ اور تقویٰ	〃	۶۸
اپریل	خدا اور الحاد	معاذ بن نور	۷۴
〃	رمضان کے اثرات / علما اور عید کا تعین	شاہد رضا	۸۰
مئی	سرسید احمد خان کا اصول تفسیر غامدی صاحب کی نظر میں	معاذ بن نور	۶۵
〃	فقہ	شاہد رضا	۷۱

اشاریہ

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جون	علم اور اس کے ذرائع	معاذ بن نور	۷۱
؍	سچا دین	شاہد رضا	۷۶
جولائی	غیر مسلم اور زکوٰۃ اور قربانی کا گوشت	کوکب شہزاد	۶۹
؍	وحی اور سائنس کا ٹکراؤ	معاذ بن نور	۷۴
؍	غیر مسلم کے ساتھ کھانا پینا	شاہد رضا	۷۹
اگست	اچھے اعمال والے غیر مسلم / غیر مسلم کو مسجد میں عبادت کی اجازت	؍	۷۱
ستمبر	دین کا صحیح فہم	؍	۷۵
؍	مذہبی داستانیں اور سائنس	معاذ بن نور	۷۶
اکتوبر	اسلام کا مخاطب	شاہد رضا	۶۷
؍	دین اور رسم و رواج	؍	۶۹
نومبر	اسلام کی افضلیت	؍	۶۹
؍	مومن کی امیدوں کا محور	معاذ بن نور	۷۲
دسمبر	پاکستان میں مندر کی تعمیر	شاہد رضا	۶۶

Monthly
ISHRAQ
Lahore

December 2024
Vol.36 No.12
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ وتفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم وتحقیق